دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۴ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۰ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۹ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ : ۲۷۶۰۰۱

شذرات

سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا مسئلہ بحث ونظر کی حدود سے نکل کر حقیقت واقعہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جو قوم صدیوں کاروانِ علم وفضل کی قافلہ سالاری کے منصب پر فائز رہی اب اس کی حیثیت گرد کارواں کی بھی نہیں رہ گئی۔ اس پس منظر میں کیرالا کے مسلم تعلیمی محاذ سے آنے والی خبر کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اچھی خبروں کے کال کے اس زمانہ میں ایسی خوش آئند اور حوصلہ بخش خبریں کم ہی سننے کو ملتی ہیں۔ اس سال کیرالا کے میڈیکل انٹرنس ٹسٹ میں ایک ہزار سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ میں مسلمان طلبہ کا تناسب ۲۵ فیصد سے زیادہ رہا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پہلی سو پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ میں ان کا تناسب ۳۴ فیصد رہا جب کہ پہلے پانچ سو طلبہ میں یہ تناسب ۲۶ فیصد رہا۔ اس سے پہلے انجینئرنگ انٹرنس کے نتائج بھی بہت حوصلہ افزا رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دنوں پہلے تک صورت حال یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم کی سطح تک تو کیرالا کے مسلمانوں کا حصہ بڑی حد تک صوبہ میں ان کی تعداد کے مطابق تھا لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں یہ تناسب ۲۷ فیصد سے گھٹ کر صرف ۱۰ فیصد رہ جاتا تھا۔ اس پس منظر میں یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کسی اتفاقی صورت حال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ دراصل کیرالا کے مسلم معاشرہ میں تعلیم کی طرف بڑھتے اور مستحکم ہوتے ہوتے رجحان کی غماز ہے۔

یہ کامیابی دراصل ایک طویل جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ ملک کے دوسرے خطوں کے مقابلہ میں کیرالا میں شرح خواندگی کا اوسط بہت بلند ہے۔ ابتدائی تعلیم کی سطح تک مسلمان بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں وہ دوسروں سے واضح طور پر پیچھے تھے۔ تعلیم اور سماجی بہبود کے میدان میں کام کرنے والی تنظیموں کی انتھک اور منصوبہ بند کوششوں کے نتیجہ میں اس خطہ میں تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھ گیا۔ چنانچہ وہاں کے طلبہ کو اب حصول تعلیم کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے

گھروں کے آس پاس کے اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکیں، ساتھ ہی کوچنگ اور ضروری رہنمائی کا اہتمام کیا گیا، نتائج سب کے سامنے ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب کیرالا کے مسلم طلبہ کی ایک بڑی تعداد سائنس، انجینئرنگ اور میڈیسن کے علاوہ آرٹس اور سوشل سائنسز میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا کرتی تھی۔ چنانچہ اُن دنوں مسلم یونی ورسٹی میں کیرالا کے طلبہ کی ایک قابل لحاظ تعداد پائی جاتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے وہاں اعلیٰ تعلیم کے حکومتی اور خود مسلمانوں کے اپنے ادارے قائم ہوتے گئے یہ صورت حال بدلتی گئی۔ اب علی گڑھ میں کیرالا کے طلبہ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس سے واضح طور پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ کسی بھی خطہ میں تعلیم کے فروغ اور اس کی توسیع کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہاں مقامی طور پر اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں۔ دور دراز کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ فیض یاب ہوسکتے ہیں۔ جنہیں اس کے لیے درکار ضروری وسائل حاصل ہوں۔ ایسی صورت میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا مسئلہ ایک عمومی تحریک کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ جب تک حصول تعلیم کا معاملہ ایک مہم اور تحریک کی صورت اختیار نہیں کرتا اس وقت تک قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔

بدقسمتی سے شمالی ہندوستان میں صورت حال اس سے یکسر مختلف ہے۔ جس خطہ میں ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کے درمیان تعلیم کے فروغ کے لیے سب سے پہلے کوششیں ہوئیں اور جہاں اس سلسلہ کی سب سے زیادہ فعال اور طاقت ور تحریک برپا ہوئی وہاں جدید ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لیے اس طرح منصوبہ بند کوشش نہیں ہوسکی جیسی کیرالا اور دوسری جنوبی ریاستوں میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ملی اداروں کا فقدان ہے۔ طلبہ کی کوچنگ اور انہیں ضروری رہنمائی فراہم کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ اب بھی دور دراز کا سفر کرنے پر مجبور ہیں۔ جو طلبہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے وہ تعلیم ہی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان تمام منفی عوامل کے باوجود گذشتہ چند برسوں میں مسلمان طلبہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے رجحان میں واضح طور پر اضافہ ہوا ہے۔ طلبہ کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا رخ کررہی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکل رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کی روز افزوں تعداد اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر

انڈسٹری میں اچھی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہورہی ہے۔فرقہ پرست طاقتوں کے لیے یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہے۔چنانچہ فرضی الزامات کے تحت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم نوجوانوں کی گرفتاری، انکاؤنٹر اور قید و بند کا سلسلہ دراصل اسی رجحان کو روکنے کے لیے ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ ہے۔اس سازش کو ناکام بنانے کی مہم میں حصہ لینا ہر حساس اور ذی شعور شہری کا فرض ہے۔سچر کمیٹی رپورٹ سے مسلم معاشرہ کی جو شبیہ ابھر کر سامنے آئی ہے اسے مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر تعلیم کے فروغ ہی کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے۔

معارف کے لیے مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کے سانحہ ارتحال کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا کہ مولانا حبیب ریحان خاں ازہری ندوی بھی اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اناللہ۔وہ علماء کے اس زمرے میں تھے جن کے رسوخ فی العلم میں کوئی شبہ نہیں، مطالعہ اور اس سے زیادہ فکر کی وسعت ان کی علمی شخصیت کی پہچان تھی۔والد ماجد مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی کی تربیت اور ندوے اور جامعۃ الازہر کی تعلیم اور لیبیا میں تدریس نے فکر ونظر کے افق ان پر اور بھی روشن کردیے تھے، ان کی کتابوں کے موضوعات بھی ان کی مشکل پسند طبیعت کے غماز ہیں۔مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم کے وہ فرزند ہی نہیں تھے ان کی علمی و مذہبی وراثت کے امین بھی تھے۔علامہ شبلی کے عاشق تھے اور اسی نسبت سے معارف اور دارالمصنّفین سے بھی محبت کا تعلق تھا۔ان کی وفات کی خبر اس وقت ملی جب میں اپنی والدہ کی وفات کی خبر سن کر گاؤں آیا تھا۔غم دوچند ہونا تھا، تعزیت کے لیے پروفیسر مسعود الرحمان خاں ندوی کو فون کیا جو مرحوم کے برادر عم زاد سے زیادہ دوست اور رفیق کار رہے ہیں۔تسلی کے کلمات کے بعد دعا یہی ہوتی ہے کہ آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔مرحوم پر مفصل مضمون انشاءاللہ آئندہ معارف میں آئے گا، یہ سطریں لکھی جاچکی تھیں کہ اتر پردیش اردو اکیڈمی کی سابق چیرمین محترمہ شیما رضوی کے اچانک انتقال کی خبر بھی آئی، سیاسی نظریات سے قطع نظر وہ دارالمصنّفین کی قدرداں تھیں، مولانا اصلاحی مرحوم سے عقیدت رکھتی تھیں، ان سے اردو والوں کو توقعات بھی تھیں۔وزارت اور اہم عہدوں کے حصول کے بعد بھی، خاندانی شرافت اور تربیت کے زیور سے آراستہ رہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب سے مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائے، آمین۔

مقالات

قرآن عظیم اور کائناتی زمینیں

زمینوں کی ایک خوف ناک طبیعی حقیقت

مولانا سعید الرحمان ندوی

ساتوں آسمانوں میں موجود ساری ہی زمینوں کے تعلق سے جس میں خود ہماری زمین بھی شامل ہے، قرآن حکیم منصوص طور پر ایک حیرت انگیز طبیعی وتکوینی حقیقت کا اعلان اس طرح کرتا ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (بقرہ: ۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں، دن اور رات کے اختلاف میں، ان جہازوں میں جو لوگوں کی نفع بخش اشیاء لے کر چلتے ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسا کر زمینوں کو ان کی موت کے بعد زندہ کر کے ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیے، ہواؤں کے بدلنے میں اور آسمانوں اور زمینوں کے درمیان مسخر بادل میں عقل مندوں کے لیے بہت ساری نشانیاں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں (السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ) کی ترکیب سے متشرح ہو رہا ہے کہ یہاں بھی (اَلۡاَرۡضُ) کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہوا ہے، جس سے اس کائنات کی ساری ہی زمینیں

ناظم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

مراد ہیں، نیز یہاں لفظ (السَّمَآءُ) بھی اسم جنس ہی واقع ہورہا ہے، کیوں کہ وہ خود بھی اسم جنس ہے اور (السَّمٰوٰت) کے سیاق میں بھی استعمال ہورہا ہے، جس سے ساتوں آسمان مراد ہیں، لہذا یہاں باری تعالیٰ کے جملہ چھ دلائل ربوبیت مذکور ہیں، جو سب کے سب واوَ عاطفہ کے ذریعے آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ان میں سے چوتھی ربانی دلیل وَمَآ أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِن مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ (اور اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانوں سے برسا کر زمینوں کو ان کی موت کے بعد زندہ کرکے ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیے) ہے۔

وقتاً فوقتاً آسمان سے پانی برسا کر ہماری زمین کے کسی خشک وبنجر حصے کو زندہ کرتے رہنے کا بیان قرآن حکیم میں بصیغۂ مضارع متعدد مقامات پر آیا ہے، مگر موجودہ آیت کریمہ میں یہ بیان اولاً بصیغۂ ماضی آیا ہے، پھر اس کے بعد تعبیر میں اعجازی تبدیلی لاتے ہوئے اس عمل کے نتیجے میں مرتب ہونے والے ایک اور فعل الٰہی وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ (اور ان میں ہر طرح کے جاندار پھیلا دیے) کا معنی خیز اضافہ کردیا گیا ہے اور اس پر مستزاد (الارض) کے بطور اسم جنس استعمال کی حقیقت بھی، لہذا ان تمام دلائل وشواہد سے بخوبی مستنبط ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہمارے روزمرہ کے عام مشاہدے میں آنے والا باری تعالیٰ کا وہ عمل نہیں ہے جس کے ذریعے آسمان پر پانی برسا کر جزوی طور پر صرف ہماری موجودہ زمین کے کسی بنجر علاقے کو سرسبز و شاداب کیا جاتا ہے، بلکہ واقعتاً اس سے مقصود انسان کو اس حقیقت عظمیٰ سے مطلع کرنا ہے کہ ہماری زمین کے بشمول عمومی طور پر کائنات کی دیگر ساری زمینیں بھی سابق میں مردہ تھیں، جنہیں ماضی ہی میں کبھی آسمانوں سے پانی برسا کر زندگی عطا کیے جانے کے بعد ان میں ہر طرح کے جاندار بسائے اور پھیلائے گئے تھے!

چنانچہ قرآن عظیم نے اپنے معجزانہ اسلوب میں اور ایک نہایت ہی صاف سیدھی تعبیر کے ذریعے عالم طبیعیات اور عالم ارضیات کے ایک ایسے راز سے پردہ اٹھادیا ہے جس کی کنہ تک اب تک دنیائے سائنس کو بھی خاطر خواہ رسائی حاصل نہیں ہوسکی ہے، جب کہ صرف ہماری موجودہ زمین پر ٹھوس علمی وسائنسی شہادتوں کی بنیاد پر قیاس آرائیاں ضرور ہورہی ہیں کہ ساڑھے

چھ کروڑ سال قبل یہ جس طرح ایک طبیعی حادثے کے نتیجے میں بنجر (مردہ) ہوکر اس کی سطح سے ڈائنوزار (Dinosaur) اور تقریباً ساری ہی نباتاتی اور حیواناتی انواع ناپید ہوگئی تھیں کیا، عمومی طور پر بانجھ کردینے والے اس طرح کے حادثات (Earth sterilizing events) اس کی طبقاتی تاریخ (Geological past) میں اور بھی پیش آچکے ہیں، جن کی وجہ سے یہاں کا حیاتیاتی دور (Life cycle) کلی طور پر معدوم ہوکر ایک سے زائد مرتبہ از سر نو شروع ہو چکا ہو؟ مگر قرآن حکیم یہاں پوری وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کررہا ہے کہ نہ صرف ہماری ایک زمین بلکہ دیگر تمام آسمانی زمینیں بھی اپنے اپنے موجودہ حیاتیاتی ادوار سے قبل مردہ ہی تھیں، جنہیں آسمانوں سے بارش کے پانی کے ذریعے سیراب کر کے زندہ کرنے کے بعد ہی ان میں ہر طرح کے جاندار بسائے اور پھیلائے گئے تھے، لہذا اس کا بہت ہی واضح اور دوررس مطلب یہ ہوا کہ ہماری زمین کے کل مظاہر حیات اور خصوصاً ہمارا موجودہ سلسلۂ انسانیت بھی اس کے حالیہ حیاتیاتی دور ہی کے مرہون منت ہیں، کیوں کہ میرے گذشتہ مضامین کی تحقیق کے مطابق یہاں بھی بسائے اور پھیلائے گئے (دَابَّةٌ) کے مفہوم میں انسان بھی شامل ہے اور یہ کہ موجودہ سلسلۂ انسانیت کی پچھلی چند ہزار سالہ تاریخ کے دوران یا ماضی قریب ہی میں سہی یہ کبھی عمومی طور پر مردہ اور بنجر بھی نہیں ہوئی ہے۔

اب اس نئی حقیقت کے انکشاف سے سے ذہنوں میں ایک بالکل ہی بنیادی اور ناگزیر سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ جب زمینیں اپنے اپنے موجودہ زندہ ادوار سے قبل مردہ تھیں تو وہ اپنی ان اموات سے قبل کیا تھیں، کیوں کہ موت کا اطلاق صرف ان پر ہوسکتا ہے جو کبھی زندہ رہے ہوں، بے جان کو کسی بھی قیمت پر مردہ نہیں کہا جاسکتا ہے اور الفاظ قرآنی بعد موتھا (ان کی موت کے بعد) سے بھی بالکل عیاں ہے کہ سابق میں ان زمینوں کو موت حالت حیات ہی میں لاحق ہوئی تھی، اس طرح اس نقطۂ نظر سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اپنی اپنی سابقہ اموات سے قبل زمینوں پر زندگی کا ایک اور دور بھی گزر چکا ہے! اور اگر اس منطق کو اور پیچھے کی جانب لوٹایا جائے تو اس سے اس ہماری زمین کی اور دیگر ساری ہی آسمانی زمینوں کی بھی متعدد مزید اموات وحیات ثابت ہوجاتی ہیں!! لہذا جب ان زمینوں کے حالیہ زندہ ادوار میں ہر طرح کی مخلوقات کو بسایا اور

پھیلایا گیا ہے تو اس سے یہ بھی خود بخود مستنبط ہوتا ہے کہ ٹھیک ان ہی کے نقش قدم پر تخلیق و آفرینش کا یہ سلسلہ ان کے سابقہ زندہ ادوار میں بھی وقفے وقفے سے جاری وساری رہ کر خود ان زمینوں کی اپنی اپنی اموات کے ساتھ نیست ونابود ہوتا رہا ہے، حسب ذیل آیات ٹھیک یہی سبق ایک دیگر پیرایے میں اس طرح دیتی ہیں:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ...... (عنکبوت: ۱۹-۲۰)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر (یعنی ایک مدت بعد) اسے (یعنی ابتدائے آفرینش کو) دہراتا بھی ہے؟ یقیناً یہ اللہ کے لیے آسان ہے، آپ کہہ دیجیے کہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اس نے آفرینش کی ابتدا کس طرح کی ہے۔

یہاں (الخلق) ''خَلَقَ ، يَخْلُقُ'' کا مصدر ہے جس کے معنے ''پیشگی نمونے کے بغیر ہی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لے آنا'' ہوتے ہیں، نیز یہ لفظ یکساں طور پر مخلوق یا صرف انسان کے لیے بھی بولا جاتا ہے، باعتبار لغت یہ تینوں معانی مشہور ومتداول ہیں، خود قرآن مجید میں بھی اس لفظ کا استعمال ان تینوں معانی میں بکثرت ہوا ہے، جس کی بالترتیب امثال ونظائر حسب ذیل ہیں:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... (شوریٰ: ۲۹)

اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق ہے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَأَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ...... (لقمان: ۱۱)

یہ ہوئی اللہ کی مخلوق، اب مجھے دکھاؤ کہ اس کے علاوہ دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟

اِنَّهٗ يَبْدَؤُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِىَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ...... (یونس: ۴)

بے شک وہی انسان (کی تخلیق) کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ بھی کرتا ہے، تاکہ ایمان لے آنے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے۔

چنانچہ یہ یہاں تینوں معانی بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیوں کہ ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے، ظاہر ہے کہ پہلے دو معانی آپس میں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہی ہیں، کیوں کہ آفرینش ہی سے مخلوق وجود میں آتی ہے، ادھر تخلیق کا عمل شروع ہوا کہ ادھر منصۂ وجود پر مخلوقات کی بھی ابتدا ہوگئی اور ان دونوں معانی کے تعلق سے اس تیسرے معنے کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جس پر مفصل گفتگو انشاء اللہ العزیز کسی مضمون میں کی جائے گی، البتہ اس وقت ہم یہاں صرف پہلے معنے اخذ کرنے ہی پر اکتفا کریں گے، اسی طرح حقیقی طور پر اور لغت کے اعتبار سے ''بَدَأَ ، أَبْدَأَ اور اِبْتَدَأَ '' آپس میں ایک دوسرے کے مترادف ہیں جن کے معنے کسی کام کی شروعات کرنا ہوتے ہیں اور یہاں وہی مراد بھی ہیں جیسا کہ ایک دوسرے موقع سے ارشاد باری ہے:

...... وَبَدَأَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ — اس نے خلقت انسانی کی شروعات مٹی سے کی۔
(سجدہ : ۷)

نیز قرآنی تعبیر سے بالکل عیاں ہے کہ (يُعِيْدُهٗ) (وہ اسے دہراتا ہے) میں موجود ضمیر متصل ''ہٗ'' سے اشارہ ابتدائے آفرینش ہی کی جانب ہے، چنانچہ ان الفاظ کے حقیقی معانی اور اس ضمیر کے حقیقی مرجع کی حقیقت دونوں سے مستنبط ہوتا ہے کہ زیر بحث آیات کریمہ میں أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہراتا بھی ہے؟) کے ذریعے انسان کو ابتدائے آفرینش اور اس کے پھر سے اعادے یعنی خلقت کے بار بار از سر نو دہرائے جانے کے عمومی عمل میں غور وفکر کی دعوت پیش کی جارہی ہے، لہذا اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ یہاں بیان قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے کا نہیں ہورہا ہے، کیوں کہ اس دن تخلیقی عمل کی ابتدا کو از سر نو دہرایا نہیں جاتا ہے، بلکہ مردوں کو ان کی قبروں سے آناً فاناً نکالا جاتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل ارشادات سے واضح ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ — صور پھونکا جائے گا تو وہ فوراً قبروں سے اپنے رب کی طرف دوڑے چلے آئیں گے۔
(یٰسٓ : ۵۱)

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (یٰسٓ:۵۳) وہ تو صرف ایک آواز ہوگی، پھر وہ سب دفعۃً ہمارے حضور میں پیش کیے جائیں گے۔

لہٰذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں بیان معنی خیز طور پر پچھلے ارشاد باری کے ذریعے ثابت شدہ کائنات کی ساری ہی زمینوں کے متعدد زندہ و مردہ ادوار اور تسلسل کے ساتھ ان کے ہر زندہ دور میں عمل تخلیق کی ازسرنو ابتدا کیے جاتے رہنے کا ہو رہا ہے، اسی لیے اس سے متصل اگلی آیت میں قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (آپ کہہ دیجیے کہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ اس نے آفرینش کی ابتدا کس طرح کی ہے) کے ذریعے خود اپنی زمین پر رواں تخلیق کی شروعات کیسے ہوئی ہے، اس میں بھی تفکر و تدبر پر ابھارا جارہا ہے، چنانچہ یہ فقرہ منصوص طور پر ناطق ہے کہ ہماری زمین پر زندگی کا جو وجود ہے اور یہاں جو بھی انواع حیات موجود ہیں وہ سب کی سب اچانک اور یک بارگی ظہور پذیر نہیں ہوئیں، بلکہ ان سب کا ایک نقطہ آغاز بھی رہا ہے، اس وقت یہ احتمال ضرور موجود ہے کہ اس ارشاد ربانی کے ذریعے غور وفکر کی جو دعوت دی جارہی ہے وہ اس عالم مادی کی طبیعی تخلیق میں ہو، مگر یہ آخر الذکر آیت اس امکان کو حتمی طور پر خارج کرنے والی ہے، کیوں کہ زمین پر چلنے پھرنے سے یعنی اس کی داخلی شہادتوں سے جو علم حاصل ہوگا وہ مطالعۂ حیاتیات اور اس کے نقطۂ آغاز تک نفوذ حاصل کرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے، برعکس طبیعیات کے جس کے لیے عموماً سارا انحصار خارجی شواہد ہی پر ہوتا ہے۔

چنانچہ اس دعوت الٰہی سے پوری وضاحت کے ساتھ مستنبط ہوتا ہے کہ انسان اپنے طور پر اس عظیم طبیعی و آفاقی حقیقت کا صحیح صحیح ادراک بھی کرسکتا ہے، ورنہ اسے اس پر کبھی ابھارا ہی نہ جاتا، ملحوظ رہے کہ یہاں خلقت کے بار بار ازسرنو دہرائے جانے کے عمل میں غور وفکر کے لیے بھی (اَوَلَمْ يَرَوْا) ہی کے ذریعے دعوت دی جارہی ہے، جب کہ آج وہ عمل کسی بھی طرح ہماری رویت عینی و نظری میں نہیں ہے، لہٰذا اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں دعوت رویت علمی و استدلالی ہی کی دی جارہی ہے، یہی وجہ تھی کہ ہم نے اپنے سابقہ ''قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات'' والے مضمون میں طبق در طبق قائم ساتوں آسمانوں اور ان کی موجودات کی رویت کو بھی ٹھیک اسی

پرمحمول کیا تھا، لہذا آج انسان اس عدیم المثال خدائی دعوت پر معنوی انداز میں لبیک کہہ کر اور اس پر اپنی مہر تصدیق پوری طرح سے ثبت کرتے ہوئے تجرباتی ومشاہداتی میدان میں کم از کم ہمارے نظام شمسی کے بعض زمینی سیاروں پر ممکنہ تخلیق وتخریب کے عوامل پر روز بہ روز کافی وقیع علمی وعقلی دلائل و براہین بھی قائم کرتا جارہا ہے اور خود ہماری موجودہ زمین کے ضمن میں بھی یہ بحث کافی ترقی کرچکی ہے، جس پر مفصل گفتگو آگے آرہی ہے۔

اس طرح موجودہ بیان پچھلے بیان کے ذریعے ثابت شدہ ساری زمینوں کی سابقہ اموات کی حقیقت کو مزید موکد کرتے ہوئے اس سے بھی قبل ان پر تسلسل کے ساتھ وقفے وقفے سے جاری رہے موت وحیات کے مختلف ادوار کی حقیقت کو منکشف کرنے والا ہوجاتا ہے، لہذا جب ہماری موجودہ زمین سمیت ہر کائناتی زمین پر بھی اس کے اپنے حالیہ زندہ دور ہی کے مانند متعدد مزید ادوار سابق میں بھی گزر چکے ہیں اور ہر مرتبہ ان میں حیاتیات کا عمل از سر نو شروع کرکے ختم بھی کیا جاچکا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان سابقہ پیدائشوں کا خدائی مقصد کیا تھا؟ کیا اس وقت بھی موجودہ انسانی وجناتی نسلوں ہی کی طرح کوئی اور مکلّف مخلوقات ان میں بسائی گئی تھیں؟ چنانچہ خود موجودہ قرآنی بیان کی شرح وتفسیر اور مزید روشنی کے لیے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب یہاں بھی ٹھیک اسی قسم کی تعبیر کا استعمال کرتے ہوئے صرف ہماری موجودہ زمین کے پس منظر میں دیا جارہا ہے، جس پر دیگر زمینوں کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے:

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ کَانُوۡۤا أَشَدَّ مِنۡھُمۡ قُوَّۃً وَّأَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَ عَمَرُوۡھَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡھَا وَ جَآءَتۡھُمۡ رُسُلُھُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَھُمۡ وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَھُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ثُمَّ	کیا انہوں نے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان سے قبل والوں کا انجام کیسا رہا تھا؟ وہ قوت میں ان سے بھی زیادہ بڑھے ہوئے تھے، انہوں نے زمین کو جوتا تھا، اسے ان سے بھی زیادہ آباد کیا تھا، اور ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں بھی لے آئے تھے، سو اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا، بلکہ اپنے اوپر ظلم کرنے والے خود وہی

كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ أَسَآءُ وا السُّوٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُ وْنَ اَللّٰهُ يَبْدَؤُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (روم: ۹-۱۱)

تھے۔ پھر برا کرنے والوں کا انجام بھی برا ہی ہوا، کیوں کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اوران کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اللہ ہی آفرینش کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دہراتا بھی ہے، پھر تمہیں اسی کے پاس لوٹایا بھی جائے گا۔

اگر سابقہ ارشاد میں باری تعالیٰ کی جانب سے تخلیق کے از سر نو بار بار دہرائے جانے کی خبر دے کر قُلْ سِيْرُوْا فِى الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ کے ذریعے ہماری زمین پر صرف رواں تخلیق کی ابتدا پر غور وفکر کی دعوت دی تھی تو اب موجودہ ارشاد میں ٹھیک اسی طرح کی تعبیر أَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کے ذریعے اس پر گزرے سابقہ تخلیقی ادوار میں بھی بسائی گئی مخلوقات کے سوء انجام کے مشاہدے پر ابھارا جارہا ہے۔ چنانچہ اس مفہوم کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے ہی کی خاطر آخر میں ایک اور مرتبہ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ کا اعادہ بھی کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تسلسل کے ساتھ آفرینش مخلوقات کی ابتدا کرتا اور اسے دہراتا بھی رہتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ فقرہ اگر سابقہ ارشاد کی بالکل ابتدا میں بیان کیا گیا تھا تو یہاں تعبیر کی تبدیلی کے ذریعے بالکل آخر میں واقع ہورہا ہے۔ چنانچہ ان دونوں بیانات کے درمیان تعبیر کا یہ اتحاد ان کے معنوی اتحاد کا بھی فائدہ دیتا ہے۔

لہٰذا اس ربانی ارشاد کے مطابق زمین کی سابقہ مخلوقات وہ ہوئیں جو زمین جوتنے والی اور قوت، طاقت اور عددی کثرت میں بھی ہم سے بہت فائق و برتر تھیں۔ نیز ان کے درمیان ربانی نشانیوں کے ساتھ انبیاء ومرسلین بھی مبعوث کئے گئے تھے، جن کی تکذیب ہی کی بنیاد پر انہیں نیست ونابود کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زمینوں پر زندہ اور مردہ ادوار کا ورود وذہاب ان میں مکلّف مخلوقات کی بالترتیب تخلیق وتعذیب ہی کے لئے ہوتا ہے، مزید برآں اس موقع سے دعوت الٰہی أَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْأَرْضِ سے ایک اور نکتہ مستنبط ہوتا ہے کہ موجودہ انسان جس طرح زمین پر رواں تخلیقی دور اور اس کے آغاز پر علمی دلیل قائم کرسکتا ہے ٹھیک اسی کے موافق اس پر گزرے اسی طرح کے سابقہ ادوار اور ان میں بسائی گئی مخلوقات کے

انجام کو بھی اپنے احاطہء علمی میں لاسکتا ہے، چنانچہ ان دونوں بیانات کی مزید تاکید کے لئے حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ. وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ، أَحْيَيْنٰهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُوْن (یٰسٓ: ۳۱-۳۳)	کیاانہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے ان سے قبل کتنی ہی نسلوں کو ہلاک کر دیا ہے، جو خود اپنی ہی جانب لوٹ کر نہیں آتی ہیں؟ اوران میں سے ایسی کوئی بھی نہیں جو مجموعی طور پر ہمارے آگے حاضر نہ کی جائے۔ اوران کی (ہلاکت کی) ایک بڑی علامت مردہ زمین ہے، جسے ہم نے زندہ کر کے اس سے اناج نکالا ہے، جس سے وہ کھاتے ہیں۔

ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں کتنی صراحت کے ساتھ سابقہ نسلوں کی تباہی کی ایک بڑی اور واضح علامت زمین کی مردہ حالتیں قرار دی جارہی ہیں، جس سے ہم اس کی کسی مزید توجیہ سے مستغنی ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس سے سابق میں ہماری زمین کی صرف ایک زندگی اور ایک موت نہیں بلکہ متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہورہی ہیں، جس سے زمینوں کے کثرت اموات وحیات کا اخذ کردہ مذکورہ بالا مفہوم اور زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے، لہذا اس کا صریح مطلب یہ ہوا کہ ان سابقہ نسلوں کا تعلق زمین کے سابقہ حیاتیاتی ادوار ہی سے ہے، جنہیں یکے بعد دیگرے اس کی ہر موت کے ساتھ ہلاک وبرباد کردیا گیا تھا۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ہم نے اپنے ایک اور سابقہ مضمون ''قرآن عظیم اور کائناتی مخلوق'' میں کائناتی تناظر میں قَــرْنٌ سے جس طرح ایک زمین کی پوری مخلوق مراد لی تھی یہاں اس فلسفے میں مزید نکھار پیدا کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جب یہ اصطلاح ایک ہی زمین کے مختلف زندہ ادوار کے پس منظر میں استعمال کی جائے تو اس سے اس کے کسی بھی ایک زندہ دور کا پورا سلسلۂ مخلوق مراد ہوجاتا ہے، موجودہ بیان بھی اسی نوع سے تعلق رکھنے والا ہے، چنانچہ قَرْنٌ سے مراد لئے گئے ہمارے اس مفہوم اور خود موجودہ بیان کی مزید تائید وتقویت کے لئے حسب ذیل دو مزید بیانات بھی ملاحظہ ہوں:

أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ، إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي النُّهٰى۔ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّأَجَلٌ مُّسَمًّى

(طہٰ: ۱۲۸- ۱۲۹)

کیا انہیں اس امر سے سبق حاصل نہیں ہوا کہ ہم نے ان سے قبل کئی نسلیں ہلاک کر دی ہیں، جن کے مسکنوں میں (اب) یہ چل پھر رہے ہیں؟ بیشک اس میں عقل مندوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں اور اگر آپ کے رب کی جانب سے ایک بات اور ایک معین میعاد پہلے ہی سے طے نہ ہوتے تو عذاب (ان پر بھی) لازمی طور پر آ ہی گیا ہوتا۔

یہاں لَهُمْ سے اشارہ موجودہ منکرین کی جانب ہے، جس کے ذریعے اس طبقے سے عمومی طور پر بصیغہء غائب خطاب کیا جارہا ہے۔ اسی طرح اس قرآنی تعبیر سے ظاہر ہے کہ يَمْشُوْنَ میں موجود ضمیر جمع لَهُمْ میں موجود ضمیر جمع کی جانب لوٹ رہی ہے۔ نیز یہاں وعید کے پیش نظر ہی موجودہ نسل انسانی کا صرف منکر طبقہ مخاطب ہے۔ ورنہ اس میں مومنین بھی داخل ہیں، کیوں کہ سابقہ نسلوں کے مسکنوں میں چلنے پھرنے والوں میں وہ بھی بنفس نفیس شامل ہیں۔ چنانچہ اس عمومی تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سابقہ نسلیں جن کے مسکنوں میں اب ہم چل پھر رہے ہیں وہ اس سرزمین پر اس کے سابقہ زندہ ادوار میں بسا کر ہلاک کی گئی مخلوقات ہی ہیں۔ اسی لئے اگلی آیت میں خود ہمیں بھی یہ وعید پیش کی جارہی ہے کہ اگر ہماری بھی ہلاکت کا ایک وقت متعین نہ ہوتا تو ان سابقین کے نقش قدم پر اب تک ہمیں بھی کیفر کردار کو پہنچا دیا گیا ہوتا۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا، كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ

(یونس: ۱۳- ۱۴)

یقیناً ہم تم سے قبل بہت ساری نسلوں کو جب وہ ظالم بنے ہلاک کر چکے ہیں، حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر وہ ایمان لے آنے والے نہیں تھے ہم مجرموں کا بدلہ اسی طرح دیا کرتے ہیں، پھر (ایک مدت بعد) ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، تا کہ دیکھیں تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

ان آیات میں قَبۡلِكُمۡ اور جَعَلۡنٰكُمۡ سے بالکل عیاں ہے کہ پچھلے ارشاد ہی کی طرح یہاں بھی خطاب کی نوعیت عمومی ہے، چنانچہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں موجودہ نسل انسانی کوزمین کے رواں زندہ دور میں سابقہ نسلوں کے مسکنوں میں چلنے پھرنے والی بنائے جانے کا مزید کیا مطلب ہوسکتا ہے اس کی توجیہ یہاں اس طرح کی جارہی ہے کہ ان سابقہ نسلوں کو ہلاک کردئے جانے کے ایک عرصہ بعد ہی اسے اس میں ان کا خلیفہ بنا کر آزمایا جارہا ہے، ملحوظ رہے کہ ثُمَّ ترتیب کے ساتھ تراخی یعنی دوافعال کے درمیان زمانے کی دوری کا بھی فائدہ دیتا ہے۔ چنانچہ آئندہ مباحث سے ثابت ہوگا ایک زمین کی دوالگ الگ نسلوں یا بالفاظ دیگر اس کی دوالگ الگ زندگیوں کے درمیان نہایت طویل زمانی فاصلہ بھی ہوتا ہے۔ جدید فلکیات کی رو سے بھی اس مظہر ربوبیت پر کافی روشنی پڑسکتی ہے، اس طرح موجودہ بیان پچھلے بیان کی تفسیر وتوجیہ کرنے والا ہوجاتا ہے، چنانچہ اب دومزید ارشادات بھی ملاحظہ ہوں جوان سابقہ زمینی مخلوقات کی حقیقت کوالگ الگ پیرایوں میں اورزیادہ قوت واستحکام پہنچانے والے ہیں:

يٰۤأَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡن (بقرہ: ۲۱)	اے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور انہیں بھی جو تم سے قبل رہ چکے ہیں، تاکہ تم پرہیزگار بن سکو۔

قرآن مجید کی اولین سورۂ بقرہ کے ابتدائی دورکوعات میں موجودہ انسان کی مومن، کافر اور منافق کی سہ گانہ تقسیم کے بعداب تیسرے رکوع کی موجودہ پہلی آیت میں پہلی مرتبہ نوع انسانی سے عمومی طور پر مخاطب ہوکر اسے اپنے رب کی عبادت پر ابھارا جارہا ہے، چنانچہ اس موقع سے الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ (جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تم سے قبل رہ چکے ہیں) کے ذریعے یہ معنی خیز اشارہ کیا جارہا ہے کہ بلاشرکت غیرے صرف تم ہی اکیلے اس زمین پر پیدا نہیں کئے گئے ہو، بلکہ تم سے قبل یہاں اور بھی مخلوقات کوخلعت وجود سے نوازا جاچکا ہے۔

أَوَلَمۡ يَهۡدِ لِلَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡأَرۡضَ مِنۡ بَعۡدِ أَهۡلِهَا أَنۡ لَّوۡ نَشَآءُ أَصَبۡنٰهُمۡ بِذُنُوۡبِهِمۡ ...... (اعراف: ۱۰۰)	کیا ان لوگوں کو واضح نہیں ہوا جو زمین کے باشندوں کے بعد اس کے وارث بنے ہیں کہ ہم اگر چاہتے توانہیں بھی ان کے گناہوں کے عوض

میں پکڑ لیتے۔

قرآنی تعبیرات اَلَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡاَرۡضَ (جو زمین کے وارث بنے ہیں) اور مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَا (اس کے باشندوں کے بعد) سے بالکل واضح ہے کہ یہاں خطاب عمومی طور پر ساری انسانیت کے پس منظر میں ہو رہا ہے، چنانچہ زمین کے سابقہ سارے باشندوں کو ان کے گناہوں کے عوض ہلاک کئے جانے کے بعد موجودہ انسان کو اس کا وارث اور خلیفہ بنائے جانے کے بیان سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ وہ قدیم باشندے سابقہ زمینی مخلوقات ہی ہیں، چنانچہ یہاں مِنۡۢ بَعۡدِ اَهۡلِهَا (زمین کے سابقہ باشندے) اور پچھلے ارشاد میں وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ (جو تم سے قبل رہ چکے ہیں) باہم ایک دوسرے کی بحسن وخوبی شرح وتفسیر کرنے والے ہیں۔

اس طرح یہ ساری آیات اس زمین پر وقفے وقفے سے بسا کر ہلاک کی گئی سابقہ مخلوقات کے خدوخال واضح کرنے والی ہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے معنی خیز طور پر ان مخلوقات کی تعیین وتشخیص صراحت کے ساتھ اور براہ راست کسی مخصوص نام سے نہ کرتے ہوئے اس ضمن میں صرف بلیغ اشارات ہی پر اکتفا کیا ہے، البتہ جب ہمارے پچھلے مضامین سے مختلف پیرایوں میں اور نہایت مدلل طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ جن وانس کی تخلیق ساتوں آسمانوں میں ابتلا وآزمائش ہی کی خاطر کی گئی ہے اور یہ کہ قرآن مجید میں کہیں بھی ان کے علاوہ کوئی اور مخلوق مذکور نہیں ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کلیے کو ہماری زمین کے ہر زندہ دور اور اس میں بسائی گئی مخلوقات پر بھی بحسن وخوبی منطبق کیا جاسکتا ہے، مزید برآں اوپر سورۂ یٰسٓ، طٰہٰ اور یونس والے تینوں بیانات کے مطابق خود موجودہ نسل انسانی بھی زمین کی سابقہ نسلوں کے مانند صرف ایک اور نسل ہی ہے اور یہی وجہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی اس ضمن میں پراسرار خاموشی اختیار کئے ہوئے نظر آ رہی ہے، چنانچہ فی الحال ہم صرف ان مضبوط بنیادوں ہی پر تکیہ کرتے ہوئے اور قارئین کرام سے رخصت چاہتے ہوئے ان ساری ماقبل مخلوقات کو بھی راست طور پر جن وانس ہی سے موسوم کر دے رہے ہیں، انشاءاللہ تعالیٰ ہمارے اگلے مباحث سے بخوبی ثابت ہوگا کہ ان کی یہ عارضی اجازت کسی بھی طرح رائگاں نہیں گئی، چنانچہ جب ہماری صرف ایک زمین کے مختلف زندہ ادوار میں اس قدر انسانی وجناتی نسلوں کو وقفے وقفے سے بطور امتحان وآزمائش بسا

کر ہلاک کیا جانا ثابت ہو رہا ہے تو اس پر دیگر ساری آسمانی زمینوں کے ثابت شدہ بے شمار زندہ ادوار کو بھی بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اب منطقی طور پر ذہنوں میں ایک سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ زمینوں کی موت وحیات کیا چیز ہوتی ہے جو اس قدر معنی خیز اور انقلابی تبدیلیوں کا باعث ہوتی ہو؟ چنانچہ اس کے لئے بھی ہم اپنی موجودہ زمین کی موت وحیات کا جائزہ لیتے ہوئے اس مظہر ربوبیت کو دیگر زمینوں کے پس منظر میں بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ اوپر سورۂ بقرہ والے بیان کے مطابق جب ہماری زمین بشمول دیگر ساری زمینوں کو ان کی حالت موت میں آسمان سے پانی برسا کر زندہ کیا گیا تھا تو اس کا منطقی ولازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اِن کی اُن مردہ حالتوں میں ہر جگہ پانی کا فقدان تھا، اس سے خود بخود یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اپنی سابقہ اموات سے قبل زمینیں جب زندہ تھیں تو اس وقت ان میں پانی ضرور موجود تھا، جو بعد میں ان کی اموات کے ساتھ ہی معدوم کر دیا گیا ہوگا یعنی زمینیں جب زندہ ہوتی ہیں تو ان میں پانی موجود رہتا ہے اور جب وہ مردہ ہو جاتی ہیں تو وہ بھی وہاں سے ختم ہو جاتا ہے، قرآن مجید ایک اور مقام پر نہایت ہی صراحت کے ساتھ یہ عمومی اعلان کرتا ہے کہ ساتوں آسمانوں میں موجود ساری انواع حیات کو بھی پانی ہی سے پیدا کیا گیا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ أَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ...... (انبیاء: ۳۰)	کیا کفار نے نہیں دیکھا کہ سارے آسمان اور زمینیں آپس میں جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا جدا کرتے ہوئے (ان میں موجود) ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔

السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ کی ترکیب سے ایک اور مرتبہ ظاہر ہے کہ یہاں بھی کلام سارے آسمانوں اور زمینوں کے پس منظر میں ہو رہا ہے اور اس متصل سیاق میں كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (ہر زندہ چیز) سے مراد کل کائنات کی تمام زندہ اشیاء ٹھہرتی ہیں، اس طرح اس اعلان سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر زندہ نوع چاہے وہ نباتات کی قبیل سے ہو یا حیوانات کی، یا خود زمینیں ہی کیوں نہ ہوں سب کو پانی ہی سے پیدا کیا گیا ہے۔

اب ہم اس فلسفۂ خلق وفنا کو اور آگے بڑھاتے ہوئے دیکھیں گے کہ ہماری موجودہ

زندہ زمین کا حشر آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، کیا ہم پر قیامت آنے والی ہے یا حسب سابق اور ساری کائنات میں جاری عام سنت الٰہی کے موافق اسے پانی کی معدومی کے عمومی عذاب کے ذریعے ایک اور مرتبہ موت کی نیند سلا کر یہاں کی ساری ہی انواع حیات کو ختم کر دیا جائے گا؟ حسب ذیل آیات کریمہ بھی ہمارے موجودہ طرز فکر کو کافی جلا بخشنے والی اور مزید تقویت پہنچانے والی ہیں:

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا، حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ، فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضْعَفُ جُنْدًا (مریم:۷۵)	کہہ دیجئے کہ جو گمراہی میں مبتلا ہیں رحمٰن بھی انہیں خوب ڈھیل دئے جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے، چاہے وہ عذاب ہو یا قیامت، تب معلوم کرلیں گے کہ برے مرتبے اور کمزور لشکر والا کون ہے۔
قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُونَ، إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (انعام: ۴۰)	کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ تم پر چاہے اللہ کا عذاب آئے یا قیامت ہی آجائے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟

ان دونوں آیات میں الفاظ قرآنی سے پوری طرح عیاں ہے کہ خطاب رسول اللہؐ کے توسط سے عمومی نوعیت ہی کا ہے، چنانچہ یہ دونوں ہی آیات دوٹوک الفاظ میں اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے جس چیز کا وعدہ فرما رہا ہے وہ قیامت بھی ہوسکتی ہے یا کوئی دوسرا عذاب بھی، چنانچہ ہم پر کسی قسم کے عذاب بھیجے جانے کے احتمال کی موجودہ تصریح نہایت اہم اور کافی معنی خیز ہے، کیوں کہ حتمی طور پر اگر ہم پر قیامت ہی واقع ہونے والی ہوتی تو یہاں کسی دوسرے عذاب کے امکان کا ذکر ہی بے معنی ہوتا، جس کی توقع ذات باری تعالیٰ سے کسی بھی قیمت پر نہیں کی جاسکتی ہے، لہٰذا کلام الٰہی اس ضمن میں ہماری مزید رہنمائی اس طرح کرتا ہے:

أَفَأَمِنُوٓا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (یوسف:۱۰۷)	سو کیا یہ اس سے بےفکر ہو چکے ہیں کہ ان پر اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب آپہنچے یا اچانک ان پر قیامت ہی آپڑے، اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (حج: ۵۵)	کافر ہمیشہ اس (قرآن) کی طرف سے شک میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت یا ایک بنجر دن کا عذاب ہی آجائے۔

پچھلی دونوں آیات میں قیامت کے بجائے ہم پر نازل ہونے والے جس عذاب کے احتمال کا ذکر تھا موجودہ دونوں آیات اس کو مزید واضح کرتے ہوئے اسے کسی حد تک یقینی صورت حال میں تبدیل کرنے والی ہیں، لہذا یہاں پہلی آیت میں غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) کے ذریعے یہ خبر دی جارہی ہے کہ ہم پر کوئی عمومی عذاب ایسا بھی نازل ہوسکتا ہے جو یہاں کے سارے ہی موجودات کو ڈھانک کر اپنی آغوش میں لے لینے والا ہو، جب کہ دوسری آیت میں عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (ایک بنجر دن کا عذاب) کے ذریعے اس ممکنہ عذاب کی ایک اور صفت یہ بھی بیان کی جارہی ہے کہ وہ ایک بنجر کر دینے والا عذاب ہی ہوگا۔

ملحوظ رہے کہ ان چاروں آیات میں سے ہر آیت کریمہ کے ذریعے عذاب الٰہی الْعَذَابُ کو نہایت دوٹوک الفاظ میں قیامت السَّاعَة کے بالمقابل پیش کیا گیا ہے، جو کافی معنی خیز ہے، اب حسب ذیل آیت کریمہ ملاحظہ ہو، جس کے ذریعے بالکل صریح الفاظ میں خبر دی جارہی ہے کہ ہم پر قیامت کے بجائے یقینی طور پر عذاب ہی نازل ہونے والا ہے:

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (سبا: ۴۶)	وہ تو تمہیں ایک سخت عذاب کے وقوع سے قبل صرف ایک ڈرانے والے ہیں۔

چنانچہ کتاب اللہ اس فلسفے کو اور زیادہ آگے بڑھاتے ہوئے ان آیات کی مزید توضیح وتشریح اس طرح کرتی ہے:

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ (ملک: ۳۰)	کہہ دیجئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر تمہارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جائے تو تمہارے پاس سطحی سیال پانی کون لے کر آئے گا؟

سابقہ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) اور عَذَابُ يَوْمٍ

عَقِیۡمٍ (ایک بنجر دن کا عذاب) سے کیا مراد ہوسکتا ہے اس کی تصویر کشی یہاں ایک نہایت دوررس طبیعی حقیقت اور ہمہ گیر فلکیاتی مظہر کے روپ میں کی جارہی ہے،لغت کے اعتبار سے غَوۡرًا ''غَا رَ، یَغُوۡرُ'' کا مصدر ہے،جس کے معنے''زمین کے اندر دھنسنا'' ہوتے ہیں اور یہاں اس کا استعمال مَـآءٌ (پانی) کی صفت کے طور پر ہورہا ہے،یاد رہے کہ جب مصدر ہی کو صفت کے طور پر استعمال کردیا جاتا ہے تو معنوی اعتبار سے اس میں ''غَائِرٌ'' سے بھی زیادہ تاکید پیدا ہوجاتی ہے،چنانچہ''اَلۡمَـاءُ الۡغَوۡرُ'' کے معنے''زمین کے خوب اندر دھنسنے والا'' ہوجاتے ہیں اور مَـآءٌ مَـعِیۡنٌ لغت اور روایت دونوں ہی اعتبارات سے اس پانی کو کہتے ہیں جو آنکھوں کو نظر آئے اور سطح زمین پر جاری بھی ہو:

"ظاهر تراه العين جاريا على وجه الأرض" (تاج العروس)

"ظاهر جار على وجه الأرض" (القاموس المحيط)

"نابع سائح جار على وجه الأرض" (تفسير ابن كثير)

"الجاری" (تفسير طبرى عن قتادة والضحاك)

چنانچہ آج ٹھیک یہی وہ پانی ہے جسے جدید فلکیات کی اصطلاح میں ''سطحی سیال پانی'' (surface liquid water) کہا جاتا ہے،واضح رہے کہ اس آیت کریمہ کے ذریعے اسی سورۂ ملک کی سابقہ آیت نمبر ۲۵ میں منکرین کی جانب سے وعدۂ عذاب الٰہی کی تکمیل کے مطالبے : وَیَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ وعدہ کب جا کر پورا ہونے والا ہے؟) کا جواب ایک حیرت انگیز اور انتہائی معنی خیز سوال کے ذریعے دیا جارہا ہے، چنانچہ اس جوابی سوال کے مطابق ہمارے اوپر نازل ہونے والے عذاب کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ماضی میں ہماری مردہ زمین کو جس طرح بارش کے پانی سے زندہ کرکے اس میں سارے مظاہر حیات کو وجود بخشا گیا تھا اب سطح زمین کا سارا پانی زیر سطح خوب اندر کی جانب دھنسا دیا جائے گا، جس سے وہ عمومی اور کلی طور پر خشک وبنجر میدان میں تبدیل ہوکر اس پر موجودہ سارے انواع حیات (نباتاتی اور حیواناتی دونوں) نیست ونابود ہوجائیں گے! غور کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے لئے اِنۡ اَصۡبَحَ مَـآؤُکُمۡ غَـوۡرًا (اگر تمہارا پانی زمین کے اندر خوب دھنس

جائے) کی موجودہ خدائی وعید اور مذکورہ بالا ہم پر نازل ہونے والے ممکنہ عذابات: غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ (اللہ کا کوئی ڈھانکنے والا عذاب) اور عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (ایک بنجر دن کا عذاب) کی کس قدر درست تفسیر وتوجیہ کرنے والی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ہماری زمین کا سارا پانی خوب اندر کی جانب دھنسا دیا جائے تو وہ عذاب اس قدر مہیب اور تباہ کن ہوگا کہ پوری زمین کو ڈھانک کر اپنی آغوش میں لیتے ہوئے اسے بنجر اور چٹیل میدان بنا کر رکھ دے گا، اب حسب ذیل آیات کریمہ ملاحظہ ہوں، جو ٹھیک یہی وعید بالجزم اور نہایت دوٹوک الفاظ میں پیش کرنے والی ہیں، جس کے بعد اس ضمن میں شک وتردد کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہ جائے گی:

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى ٱلْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ وَإِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (کہف: ۷-۸)

زمین پر جو کچھ بھی ہے ہم نے اسے اس کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں اچھا عمل کون کرتا ہے اور اس پر جو کچھ بھی ہے یقیناً ہم اسے بنجر میدان بنانے والے ہیں۔

لہٰذا یہاں بطور عبارۃ النص یہ وعید پیش کی جارہی ہے کہ ہماری زمین کو آگے چل کر عذاب الٰہی کے ذریعے تباہ وبرباد کرکے اسے مردہ اور بنجر وچٹیل میدان بنا دیا جائے گا، یعنی زمین اس عذاب الٰہی کے بعد بھی جوں کی توں برقرار رہے گی، مگر اس کی زینت اور اس کی ظاہری چمک دمک اور اس کی سرسبزی وشادابی اس سے اس طرح چھین لی جائے گی اور اس پر موجود تہذیبی وتمدنی آثار اس طور سے ختم کردئے جائیں گے کہ کل اگر کوئی اس کو دیکھے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ گویا وہ کبھی آباد ہی نہیں تھی: فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (ہم نے اسے ایسا صاف کردیا گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھی)!

مزید برآں ہمارے پانی کو زمین میں خوب اندر کی جانب دھنسا کر ہم پر عذاب نازل کئے جانے کی وعید پیش کرنے کے بعد آگے ہم سے اعجازی انداز میں سوال کیا جارہا ہے کہ ہمارے پاس ''سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال پانی'' کون لے کر آئے گا، غور کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اس سوال کو منطقی طور پر اس طرح ہونا چاہئے تھا کہ اگر تمہارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جائے تو دوبارہ ''اسے'' تمہارے پاس کون لے آئے گا: ''قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا

فَمَنْ یَّأْتِیْکُمْ بِہٖ''، ظاہر ہے کہ جو چیز معدوم ہو جائے مطالبہ بھی عین اسی کی فراہمی کا ہو، مگر اس سوال میں نظم کلام سے انحراف کرتے ہوئے ضمیر کے بجائے خود مَـــآءٌ کو دوبارہ دہرا کر اس کی صفت مَعِیْنٌ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے، لہذا یہاں سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ ہمارا پانی زمین کے خوب اندر دھنس جانے کی صورت میں ہمارے پاس سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال پانی کون لے آئے گا، یعنی معدومی کسی چیز کی اور فراہمی کا مطالبہ کسی اور ہی کا، اب یہ بالکل ہی الگ بات ہے کہ خود ہمارا موجودہ پانی بھی سطح زمین پر جاری رہنے والا سیال نوعیت ہی کا ہے۔

چنانچہ اگر اس ارشاد باری پر دوبارہ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نظم کلام سے یہ انحراف محض ظاہری نوعیت کا ہے اور یہ کہ یہاں تعبیر کی اس اعجازی تبدیلی کے ذریعے یہ معنی خیز اشارہ دیا جا رہا ہے کہ عذاب کی صورت میں سطح زمین کا سیال پانی زیر زمین خوب دھنس جانے کے بعد سیال نہ رہتے ہوئے کوئی اور شکل وصورت اختیار کر لیتا ہے، جسے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اس کی ہیئت بدل کر اسے سیال بھی کرنا پڑتا ہے! یہاں یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ پانی مادے کی تینوں حالتوں یعنی سیال، منجمد (ٹھوس) اور بخاراتی شکلوں میں موجود رہتا ہے اور ماحول میں مناسب تبدیلیوں کی بنا پر اپنی ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے، جس کا ہم اپنی روزمرہ کی زندگی ہی میں بار بار مشاہدہ کرتے آ رہے ہیں، چنانچہ اس کا درجۂ حرارت اگر کم کر دیا جائے تو وہ منجمد برف ہو جاتا ہے اور جب اسے گرم کیا جاتا ہے تو اس کا درجۂ حرارت بڑھ کر وہ آبی بخارات کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب چاہے منجمد برف اور آبی بخارات کا درجۂ حرارت بالترتیب بڑھا اور گھٹا کر ان سے دوبارہ سیال پانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ یہاں عذاب الٰہی کے نتیجے میں سطحی سیال پانی کے زیر زمین دھنس کر غیر سیال منجمد (solid) یا بخاراتی (vaporized) شکلوں میں تبدیلی کے لطیف قرآنی اشارے نے ہمارے موجودہ نظام شمسی کے ایک بڑے اور انتہائی گہرے سائنسی معمے کو نہایت اعجازی طور پر حل کر دیا ہے، لہذا جدید فلکیاتی سائنس کو یہاں مریخ اور زہرہ پر زمانہ قدیم میں ایسے سطحی سیال پانی کے ٹھوس اور ناقابل تردید علمی واستدلالی اور تجرباتی ومشاہداتی ثبوت فراہم ہوئے ہیں جو فی الحال اس شکل میں نہیں ہے، بلکہ مریخ کی حد تک اس کی زیر سطح منجمد برف (subsurface frozen ice) کی

صورت میں کافی نیچے دھنسا ہوا ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جدید سائنس کو مریخ پر اس کی قدیم تاریخ میں سیال پانی کے علاوہ کرۂ ہوا (atmosphere) بھی دریافت ہو چکا ہے، جو نہایت ہلکی مقدار میں آج بھی موجود ہے، لہذا سطحی پانی کی موجودگی میں جب کرۂ ہوا لازمی طور پر کثیف تھا اس وقت وہاں کا سطحی درجۂ حرارت (surface temperature) بھی زندگی کو سہارا دینے والا اور اس کا معاون و مددگار ہوسکتا ہے، یہ اور اس طرح کے دیگر علمی و عقلی دلائل و براہین کی بنیاد پر خود دنیائے فلکیات کا محتاط اندازہ ہے کہ ماضی بعید میں جب بھی حالات سازگار تھے، وہاں زندگی کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی ہوگی جو بعد کے ناسازگار حالات کی وجہ سے ختم ہوگئی ہو، مگر زیر بحث قرآنی تصریحات کی روشنی میں اب ہمارے لئے یہ نتیجہ نکالنا نہایت آسان ہوگیا ہے کہ یہ سیارے حقیقتاً زمینیں ہی ہیں، جو ٹھیک ہماری موجودہ زمین ہی کے مانند سابق میں کبھی زندہ تھیں اور وہاں انسانی و جناتی اور دیگر مخلوقات بھی آباد تھیں، جو مذکورہ بالا ڈھانکنے والے غَاشِيَةٌ اور بنجر دن يَوْمٌ عَقِيْمٌ کے عمومی عذابوں کے ذریعے نیست و نابود کردی گئیں، ان کا پانی زیر سطح خوب دھنسا دیا گیا، جس کی وجہ سے ان کا کرۂ ہوا بھی ختم ہوتا گیا اور وہاں رفتہ رفتہ اس قدر ارضیاتی (geological) تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ وہ زمینیں آج تک بے آب و گیاہ، صاف اور چٹیل میدانوں کے روپ میں اس طرح مردہ پڑی ہوئی ہیں گویا کہ وہ کل آباد ہی نہیں تھیں: حَصِيْدًا كَأَنْ لَمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (ایسی صاف کہ گویا وہ کل آباد ہی نہیں تھیں) یعنی آج ہماری موجودہ زمین والوں کو جس عذاب سے متنبہ کیا جارہا ہے وہ سابق ہی میں مریخ وغیرہ کی زمینوں پر بعینہٖ نازل ہو بھی چکا ہے اور مستقبل میں ہماری زمین کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے اس کا ایک ہو بہ ہو اور حقیقی نمونہ ہماری عبرت و بصیرت کی خاطر خود ہماری ہی ''پچھاڑی'' میں مریخ وغیرہ کی شکل میں رکھ چھوڑ دیا گیا ہے! آج متعدد خلائی پروازوں کے ذریعے ان مردہ زمینوں کی لی گئی مختلف قریبی تصاویر کے ملاحظہ کے بعد ہی اس قرآنی تعبیر کی صحیح تصویر ذہنوں میں آسکے گی کہ تباہی و بربادی ایسی کہ وہاں ماضی میں جاری و ساری تہذیب و تمدن کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہ سکا ہے، بلکہ اب وہاں جو کچھ بھی ہے وہ صرف بنجر، مسطح زمینیں اور چٹیل اور بے آب و گیاہ میدان ہیں، لہذا حسب ذیل آیت میں ٹھیک اسی حقیقت کو مزید موکد کیا جارہا ہے:

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (احقاف:۲۷)

یقیناً ہم نے تمہارے اطراف واکناف کی بستیوں کو ہلاک کردیا ہے، پھر نشانیوں کو بہ کثرت تبدیل کرکے لایا بھی ہے، تاکہ وہ باز آجائیں۔

متقدمین نے یہاں مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى (تمہارے اطراف واکناف کی بستیاں) کا مخاطب اہل عرب کو مانا تھا، مگر چونکہ خطاب عام ہے اور اسے محدود کرنے کے لئے لغت اور شریعت دونوں ہی اعتبارات سے کوئی امر مانع بھی نہیں ہے اس لئے اسے عام برقرار رکھنا ہی اولی وافضل ہے، لہٰذا اس صورت میں ہمارے یعنی ہماری زمین کے اطراف واکناف کی ہلاک شدہ بستیوں سے مراد ہمارے نظام شمسی کی دیگر زمینیں یعنی زہرہ، مریخ وغیرہ ہوسکتے ہیں، جو حقیقت واقعہ بھی ہیں اور اگر اس دائرے میں مزید وسعت پیدا کی جائے تو اس سے ہمارے نظام شمسی کے گردوپیش کے دیگر نظام ہائے شمسی میں پائی جانے والی زمینیں بھی مراد ہوسکتی ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ مصنوعی ریڈیائی لہروں کی مدد سے ہمارا اپنے قرب وجوار کی دیگر زمینوں سے ربط وتعلق قائم ہونا اس قدر مشکل ہوگیا ہو۔

نیز یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہم نے ''قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات'' والے مضمون میں صرف ایک دنیوی آسمان کے دریافت شدہ ایک کھرب کہکشاؤں میں سے ہر کہکشاں میں کم از کم ایک زمین کے وجود پر استدلال کرتے ہوئے اس آسمان میں کم از کم ایک کھرب زمینیں مراد لی تھیں، جب کہ یہاں صرف ہماری ایک کہکشاں کے تقریباً چار کھرب سورجوں میں سے صرف ہمارے ایک سورج کے سیاراتی نظام میں ایک سے زائد زمینیں۔ زندہ یا مردہ۔ ثابت ہورہی ہیں، لہٰذا ان جدید قرآنی حقائق وبیانات کی روشنی میں بھی اور ''قرآن عظیم اور کائناتی مخلوق'' والے مضمون میں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵ کے تحت کی گئی ہماری بحث کو بھی مختصر رکھتے ہوئے زمینوں کی حقیقی تعداد پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

مریخ کی موجودہ مردہ صورت حال، جس میں اس کا کرۂ ہوا (atmosphere) تقریبا معدوم ہو چکا ہے، کائناتی تناظر میں ہمارے لئے ایک اور ہمہ گیر حقیقت اور گہری بصیرت کی بھی حامل ہے، چنانچہ وہ زمین جب زندہ تھی تو اس کا کرۂ ہوا کثیف رہا جانا ناگزیر ہے، اپنا استوائی قطر

(equatorial diameter) پونے تیرہ ہزار کلومیٹر رکھنے والی خود ہماری موجودہ زمین کا کرۂ ہوا بھی اس وقت اس کے اطراف واکناف میں تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کی بلندی تک پھیلا ہوا ہے، اس طرح کرۂ ہوا کی موجودگی میں زمین کی موٹائی پونے تیرہ ہزار سے بڑھ کر پونے سولہ ہزار کلو میٹر ہوجاتی ہے اوراس کی معدومی یعنی اس کی مردہ حالت میں یہ موٹائی سکڑ کر پھر سے اپنے اصلی پونے تیرہ ہزار کلومیٹر پر لوٹ آتی ہے، نیز یہ بھی ایک سائنسی حقیقت ہے کہ زمین اور مریخ وغیرہ زمینی سیارے اربوں سال سے سورج کے اردگرد اپنے اپنے مدار (orbit) میں نہایت تیز رفتاری سے گھوم رہے ہیں، لہذا اب جب کہ زمینوں کی متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہوچکی ہیں تو اس سے یہ حقیقت بھی مستنبط ہوتی ہے کہ وہ کبھی کرۂ ہوا کی موجودگی میں زندہ رہتی ہیں، جس سے ان کی جسامت بڑھ جاتی ہے اور کبھی عذاب الٰہی کے ذریعے اس سے معدوم ہوکر مردہ ہوجاتی ہیں، جس کی وجہ سے سمٹ کر وہ اپنی اصلی جسامت کی طرف لوٹ جاتی ہیں، اس حقیقت کا تعلق نہ صرف ہمارے نظام شمسی کی زمینوں سے ہے بلکہ کائنات کی دیگر ساری زمینوں سے بھی ہے، چنانچہ اب ملاحظہ ہو کہ قرآن حکیم حسب ذیل آیات میں عین ان ہی حقائق کو کس قدر بلیغ ومعنی خیز تعبیر کے ذریعے بے نقاب کرنے والا ہے:

أَلَمۡ نَجۡعَلِ ٱلۡأَرۡضَ كِفَاتًا أَحۡيَآءً وَّأَمۡوَاتًا	کیا ہم نے زمینوں کو تیز رفتاری سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی نہیں بنایا، اس حال میں کہ وہ
(مرسلات: ۲۵- ۲۶)	بہت مرتبہ زندہ اور بہت مرتبہ مردہ ہوتی ہیں؟

سورۂ مرسلات کی ساتویں آیت میں إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ (تم سے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہوکر رہے گی) کے ذریعے قیامت اور روز جزا کے یقینی وقوع کی خبر دیتے ہوئے آگے نوع انسانی سے بطور دلیل تین سوالات کئے جارہے ہیں، موجودہ آیات کا تعلق ان میں سے تیسرے سوال سے ہے، لہذا اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں انسان کو کسی بڑی حقیقت ہی کی جانب متوجہ کیا جارہا ہے اور پہلے دو سوالات اس طرح ہیں:

أَلَمۡ نُهۡلِكِ ٱلۡأَوَّلِينَ ثُمَّ	کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا ہے؟ پھر ہم

نُتۡبِعُهُمُ الۡاٰخِرِيۡنَ (مرسلات:۱۶) دوسروں کو بھی ان کے تابع کردیں گے۔

أَلَمۡ نَخۡلُقكُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں

(مرسلات:۱۷) کیا ہے؟

آخرالذکر ان دونوں آیات پر تفصیلی کلام ہم آگے حسب موقع کریں گے، چنانچہ یہاں کِفَاتٌ ''کَفَتَ، یَکۡفِتُ'' کا مصدر ہے، جس کے معنے تیزی سے اڑتے یا دوڑتے ہوئے اسی حالت میں اپنا دامن سمیٹنا ہوتے ہیں:

''أسرع فى العدو والطيران وتقبض فيه'' (لسان العرب)

''أسرع فى الطيران والعدو وتقبض فيه'' (القاموس المحيط)

امام لغت وادب زمخشریؒ کی تحقیق کے مطابق، جس کی تائید امام رازیؒ، قاضی بیضاویؒ، علامہ آلوسیؒ جیسے کبار مفسرین نے بھی کی ہے، کِفَاتٌ جماع الابواب ''فِعال'' سے ہونے کی وجہ سے اسم آلہ ٹھہر کر خود اس شے کا نام قرار پاتا ہے جس سے یہ فعل سرزد ہو رہا ہو:

''هو اسم ما يكفت''

مثال کے طور پر ''شَــدَّ'' کے معنے باندھنا ہوتے ہیں، چنانچہ باندھنے میں استعمال ہونے والے دھاگے ہی کو بطور اسم آلہ ''شِـدَادٌ'' سے موسوم کردیا جاتا ہے، اس لحاظ سے جو چیز تیز اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی ہو خود وہی کِفَات قرار پاتی ہے، نیز ظاہر ہے کہ یہاں بھی الۡأَرۡضُ کا استعمال بطور اسم جنس ہی ہو رہا ہے، لہذا جب زمینوں کو کِـفَـاتٌ سے تشبیہ دی جارہی ہے تو اس سے جو عظیم الشان سائنسی حقائق منصوص طور پر منکشف ہو رہے ہیں ان میں سب سے پہلی حقیقت ہماری زمین سمیت دیگر ساری ہی زمینوں کی تیز رفتار گردش ہے! واضح رہے کہ ہماری زمین سورج کے اطراف اپنے مدار میں تقریباً ایک لاکھ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے مسلسل گردش کر رہی ہے، نیز اس سلسلے کی دوسری طبیعی حقیقت یہاں زمینوں کو تیز رفتاری سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی بتایا جارہا ہے۔ اب یہ ایک نہایت منطقی وبدیہی بات ہوگی کہ اپنا دامن سمیٹنے سے قبل زمینیں اسے پھیلائے ہوئے ہی محو گردش ہوتی ہیں، کیوں کہ دامن اسی وقت سمیٹا جاتا ہے جب کہ وہ پھیلا ہوا بھی ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمینیں گردش کے دوران کبھی اپنا دامن

پھیلائے ہوئے اور کبھی اسے سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں، پھر زمینوں کی ان دونوں کیفیتوں کے لئے بالترتیب أَحۡيَآءً اور أَمۡوَاتًا بطور حال لائے گئے ہیں، اول الذکر ''حَيٌّ'' بہ معنیٰ ''زندہ'' کی جمع ہے، جب کہ آخر الذکر ''مَيِّتٌ''، بہ معنیٰ ''مردہ'' کی، یعنی زمینیں جب اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہوتی ہیں تو زندہ ہوتی ہیں، اور جب اسے سمیٹ لیتی ہیں تو مردہ ہو جاتی ہیں، نیز أَحۡيَآءً اور أَمۡوَاتًا بطور صیغہ جمع لاکر یہ معنویت بھی پیدا کی جارہی ہے کہ زمینیں صرف ایک ہی مرتبہ موت وحیات سے دوچار نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان میں یہ سلسلہ کثرت سے جاری وساری ہے، چنانچہ اب غور کیا جاسکتا ہے کہ کیا ان کا یہ دامن ان کے کرۂ ہوا کے علاوہ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے! اس طرح ایک اور مرتبہ اور ایک بالکل ہی الگ پس منظر میں زمینوں کی متعدد زندگیاں اور متعدد اموات ثابت ہو جاتی ہیں، مثال کے طور پر اس وقت ہماری زمین اپنا دامن ہوا پھیلائے ہوئے زندگی سے معمور ہے، جب کہ مریخ وغیرہ اسے سمیٹے ہوئے مضمحل ومردہ پڑے ہوئے ہیں، چنانچہ اس موقع سے ایک اور مرتبہ غور کیا جاسکتا ہے کہ السَّمٰوٰتُ کے بغیر مفرد طور پر صرف اَلۡأَرۡضُ ہی اپنی جنسیت پر کس معنی خیزی سے دلالت کرنے والی ہے، جس سے اس ضمن میں اخذ کردہ ہمارا سابقہ عمومی کلیہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتا ہے، اب موجودہ ارشاد باری کی مزید تاکید وتقویت کے لئے حسب ذیل آیات بھی ملاحظہ ہوں:

ءَأَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِي السَّمَآءِ أَنۡ يَّخۡسِفَ بِكُمُ الۡأَرۡضَ فَإِذَا هِيَ تَمُوۡرُ أَمۡ أَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِي السَّمَآءِ أَنۡ يُّرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا، فَسَتَعۡلَمُوۡنَ كَيۡفَ نَذِيۡرِ وَلَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ أَوَلَمۡ يَرَوۡا إِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ، مَا يُمۡسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحۡمٰنُ، إِنَّهٗ بِكُلِّ شَيۡءٍ بَصِيۡرٌ أَمَّنۡ هٰذَا الَّذِيۡ هُوَ

کیا تم اوپر والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، پھر وہ اچانک تھرتھرانے لگے؟ کیا تم اوپر والے سے نڈر ہو گئے ہو کہ وہ تم پر پتھر برسادے؟ پس عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ان سے قبل والے بھی جھٹلا چکے ہیں، سو میرا عذاب کیسا رہا؟ کیا انہوں نے اپنے اوپر اڑنے والوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان میں بہت سے اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں اور بہت سے انہیں سمیٹ

جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ، إِنِ الْكٰفِرُوْنَ إِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ (ملک: ۱۶- ۲۰)

بھی رہے ہیں؟ رحمٰن ہی انہیں تھامے ہوئے ہے، یقیناً وہ ہر شے کی خوب نگرانی کر رہا ہے، بھلا تمہارا وہ کون سا لشکر ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں (جب وہ تم پر بھی عذاب بھیج دے) تمہاری مدد کر سکے گا؟ کافر تو بڑے دھوکے میں مبتلا ہیں۔

الفاظ قرآنی سے ظاہر ہے کہ ان آیات میں خطاب عمومی نوعیت ہی کا ہے، نیز طَيْرٌ ''طَائِرٌ'' کی جمع ہے، جس کا استعمال اڑنے والوں کے معنے میں غیر پرندوں کے لئے بھی ہوتا ہے، جیسے معروف عرب شاعر عنبری کا یہ قول:

طاروا إليه زرافات و وحدانا

سب لوگ اس کے پاس اجتماعی وانفرادی دونوں طریقوں سے بھی اڑ کر پہنچے۔

اسی لئے ہوائی جہاز کے لئے بھی '' طَائِرَةٌ ''ہی کا استعمال ہوتا ہے، چنانچہ موجودہ آیات میں طَيْرٌ کا استعمال اسی دوسرے معنے میں ہوا ہے، کیوں کہ پرندے اڑنے کے دوران اپنے بازو جمع یا سمیٹ نہیں سکتے ہیں، جس کی تصویر کشی یہاں يَقْبِضْنَ کے ذریعے کی جارہی ہے اور نہ ہی یہ تعبیر ان کے پر مارنے یا پھڑ پھڑانے کے لئے درست ہوسکتی ہے، جس کے لئے موزوں الفاظ ''رَفْرَفَةٌ ''یا'' صَفَقٌ ''ہوتے ہیں، نیز اس آیت میں حقیقی طور پر پرندوں کا مراد نہ ہونا اس لحاظ سے بھی درست ہوسکتا ہے کہ متصل پچھلی آیت میں موجودہ انسان سے قبل بہت ساری نافرمان نسلوں کو عذاب الٰہی کے ذریعے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے بعد اس کی دلیل اور ثبوت کے طور پر أَوَلَمْ يَرَوْا (کیا انہوں نے نہیں دیکھا) کے ذریعے اسے اوپر اڑنے والوں پر بصیرت آمیز نگاہ ڈالنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے پر آمادہ کیا جارہا ہے تو اس سے کسی معنی خیز حقیقت ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوسکتا ہے، اپنے بازو پھیلائے اور انہیں سمیٹتے ہوئے پرندوں کو دیکھنے سے کوئی بصیرت حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم ان آیات کے باہمی ربط و تعلق کا بغور جائزہ لیں تو ظاہر ہوگا کہ یہ پانچوں آیات خدائی وعیدوں پر مشتمل ہیں اور منطقی طور پر ایک دوسرے سے نہایت درجہ مربوط و منضبط بھی، چنانچہ جس طرح پچھلے ارشاد باری میں زمینوں کو اجمالی طور پر كِفَاتٌ (تیز رفتاری

سے اڑتے ہوئے اپنا دامن سمیٹنے والی) سے تشبیہ دی گئی تھی یہاں اس کی تفصیل بطور کنایہ الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صَٰفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ (بہت ساری اپنے بازو پھیلائے ہوئے اور بہت ساری انہیں سمیٹتے ہوئے اڑنے والی) سے کی جارہی ہے اور وہاں بیان کردہ زمینوں کی موت وحیات کو ان آیات کے ذریعے ایک ہمہ گیر فلسفۂ تخلیق وتخریب اور تکلیف وتعذیب کا روپ دیا جارہا ہے، لہذا ان آیات کے ذریعے ہمیں یہ تلقین کی جارہی ہے کہ ہم اللہ کی گرفت اور اس کے عذاب سے بے خطر نہ ہوجائیں، کیوں کہ ہم سے قبل بھی اس کے بہت سارے نافرمان بندوں کو ہلاک کیا جاچکا ہے، پھر ان نافرمانوں کی ہلاکت کے فوری بعد ہم سے بطور دلیل اور بغرض عبرت سوال کیا جارہا ہے کہ کیا ہم نے اپنے اوپر تیز رفتاری سے محوگردش دیگر زمینوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ ان میں بہت سی اپنے بازو پھیلائے ہوئے زندہ بھی ہیں، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو عذابوں کے ذریعے انہیں سمیٹتے ہوئے مسلسل موت سے دوچار بھی ہورہی ہیں؟ یعنی ہم سے کہا جارہا ہے کہ ہم اپنے اوپر کائنات کی بہت سی نسلوں سے سبق حاصل کریں جنہیں ان کی زمینوں سمیت ہلاک کر دیا گیا ہے، اور اس کے نتیجے میں وہ زمینیں آج تک مردہ اور بنجر ہی پڑی ہوئی ہیں۔

چنانچہ یہاں یہ قرآنی تعبیرات صَٰفّٰتٍ اور یَقْبِضْنَ جنہیں ان زمینوں کی زندہ اور مردہ حالتوں کی تصویر کشی کے لئے بطور صفات لایا گیا ہے ایک اور بصیرت کی بھی حامل ہیں، لفظی ترکیب کے اعتبار سے صَٰفّٰتٍ اسم فاعل ہے، جب کہ یَقْبِضْنَ فعل مضارع، عقل ومنطق کی رو سے یہ دوسری صفت بھی اسم فاعل یعنی ''قَابِضَاتٌ'' ہی ہوتی، کیوں کہ اول الذکر کا وصف نسبتاً زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے، جب کہ آخر الذکر کا وصف وقتی اور غیر پائیدار، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے اس مروجہ اسلوب بیان کا لحاظ نہ کرتے ہوئے اس موقع سے دو مختلف النوع صفات کا قصداً استعمال ایک دہرے مقصد کے حصول ہی کی خاطر کیا ہے، ایک یہ کہ ''قَابِضَاتٌ'' کے استعمال سے سابقہ ادوار میں اسلام پر بے عقلی کا الزام عائد نہ ہوسکے، اور ذہنوں میں یہ سوال ابھرنے ہی سے رہ جائے کہ پرندے پوری طرح سے اپنے بازو سمیٹے ہوئے فضا میں کہاں اڑ رہے ہیں؟ جب کہ یَقْبِضْنَ کی تعبیر نے وقتی طور پر اور ایک حد تک اس اعتراض کو ابھرنے پر روک لگانے کی خدمت انجام دی۔

اوراس سلسلے کا دوسرا اورنہایت بصیرت انگیز خدائی مقصد یہ ہے کہ جب ان الفاظ کے حقیقی معانی کا ظہور ہوجائے تو اسلوب بیان کی تبدیلی کے ذریعے اس مظہر الٰہی میں تاکید پیدا کرتے ہوئے نوع انسانی کو اعجازی طور پر اس حقیقت سے مطلع فرما کر اس کے اندر رجوع وانابت کا جذبہ بیدار کیا جاسکے کہ اس نے آسمانوں میں انسانی مخلوقات سے لدی ایسی زمینوں کی تخلیق ہی پر اکتفانہیں کیا ہے، جن میں سے کچھ اپنا دامن پھیلائے ہوئے زندہ ہیں تو کچھ اور ماضی ہی میں تباہ ومردہ ہوکر اسے سمیٹ بھی چکی ہیں، بلکہ کائناتی سطح پر مستقل و مسلسل تخریب وفنا کا یہ عبرت ناک سلسلہ پوری قوت وطاقت اور شان وشوکت کے ساتھ ہنوز جاری وساری بھی ہے، اور آئے دن اس کا وقوع آسمانوں میں کہیں نہ کہیں ہوبھی رہا ہے!

پھر مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ کے ذریعے اس مفہوم کو اور زیادہ تقویت پہنچائی جارہی ہے کہ ان زمینوں کو تباہ وبرباد کردینے اوران کی زندگی سلب کرلینے کے باوجود وہ باری تعالیٰ کی ذات رحمانی ہی ہے جو انہیں پوری مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، تاکہ وہ اس کے نتیجے میں اپنا فطری توازن کھوتے ہوئے دیگر سیاروں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہوجائیں اوراس کے فوراً بعد أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ کے ذریعے ہمیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ اگر اس طرح کا عذاب ہم پر بھی لایا جائے تو ہمیں اس سے کون بچا سکتا ہے؟ پھر پچیسویں آیت میں وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے ذریعے کفار کی جانب سے اس وعدۂ عذاب کی تکمیل کے مطالبے کے جواب میں تیسویں آیت میں قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ کے ذریعے خود ہماری زمین کا پانی ختم کرکے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دئے جانے اوراس کے بازؤں کو بھی سمیٹ دئے جانے کی وعید پیش کی جارہی ہے، فی الواقع اگر دیکھا جائے تو سورۂ ملک اسم بامسمی اوراول تا آخر ایک ہی فلسفے کے تحت حد درجہ منظّم ومنضبط ہے، جس میں تخلیق کائنات کی غرض وغایت اور خدائی ملکوتیت و بادشاہی کو ایمان افروز اور نہایت رقت انگیز اسلوب میں بیان کیا گیا ہے، انشاءاللہ العزیز اس سورت کی بقیہ ابتدائی آیات پر مزید روشنی ہم اپنے اگلے مضمون میں کریں گے، جس سے ہماری مراد پوری طرح واضح ہوجائے گی۔

(باقی)

مولانا سید ریاست علی ندوی

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمان

مولانا سید ریاست علی ندوی ہندوستان کے نامور مورخ، معروف محقق، اعلا صحافی اور جید عالم اور ملک کے بلند پایہ طبقۂ مصنّفین میں تھے، علمی و تاریخی تحقیق میں شبلی اسکول کے صحیح پیرو کار علامہ سید سلیمان ندوی کے خصوصی تربیت یافتہ اور ان کے علمی جاں نشیں تھے، انہوں نے سنجیدہ اسلوب بیان کی روایت کو آگے بڑھایا اور اردو زبان کو نئے اسلوب اور نئی تحقیقات سے آشنا کیا۔

مورث اعلا: ان کے مورث اعلا مینا مشہدی ایک خداترس صوفی بزرگ تھے اور شاہ جہانی عہد (۱۶۲۷ - ۱۶۵۷ء) میں ہندوستان آئے تھے، ان کے ساتھ ان کے ایک بھائی تھے جو دہلی میں مقیم ہو گئے تھے لیکن مینا مشہدی کڑا مانکپور رہوتے ہوئے صوبہ بہار پہنچے اور آبگلہ (۱) میں سکونت پذیر ہو گئے جو گیا شہر کی ایک قدیم بستی ہے، حکومت وقت نے ان کی پذیرائی کی اور گزربسر کے لیے کچھ گاؤں ان کے نام وقف کر دیے، شاہ جہانی عہد کے معاصر تذکروں میں حضرت مینا مشہدی کے حالات اور آبگلہ میں ان کے اقامت پذیر ہونے کی تفصیلات نہیں ملتی، تاہم تیرہویں صدی ہجری کے ایک تذکرہ (کنز الانساب) میں ان کے بارے میں کچھ باتیں موجود ہیں جو یہ ہیں:

''واضح باد کہ از بزرگان از مشائخ قدیم کہ آں را	واضح ہو کہ ایک قدیم بزرگ جو دو سو سال قبل
بالا از دو صد سال گذشتہ باشد از سیادت مشہدی	یہاں مشہد سے تشریف لائے تھے، اسی بستی
تشریف آوردند، در ایں دیار بداں موضع	(آبگلہ) میں سکونت پذیر ہوئے تھے، ان کی

خدابخش لائبریری، پٹنہ۔

موضع کردند، سکونت اختیار ہنوز اولادشاں در آں موضع ہستند، موجود سابقین بودند، مامور بہ منصب قضاء افتاء، حالا از پیرزادہ ملکی اند، زمین دار قرابت از آنہا بمصاہرت واقع در شرفاء ایں جوار و نیز خاکسار، باید دانست نام آں بزرگ بود حضرت مینا مشہدی‘‘۔ (۲)	اولاد بھی یہاں رہی، انہیں افتا و قضا کا منصب حاصل ہوا تھا اور یہاں کے شرفا کے یہاں ان کا دامادی رشتہ بھی قائم ہوگیا تھا، وہ بزرگ حضرت مینا مشہدی تھے۔

تذکرہ نگاروں نے عام طور پر اس روایت پر اعتماد کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ دور حاضر کے معروف محقق مالک رام (م ۱۹۹۳ء) اور دوسرے اہل علم نے اسی روشنی میں ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ (۳)

اس خانوادے میں سید یوسف علی انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک معروف حکیم اور ممتاز عالم دین تھے، ان بیٹے سید آل نبی تھے جو گیا شہر کے پہلے سرکاری وکیل تھے، عمائد شہر میں شمار ہوتے تھے۔ (۴)

آبا و اجداد: مولانا ریاست علی ندوی کے حقیقی پیر دادا سید اولاد علی تھے اور حقیقی نانا سید امید علی جو دونوں ایک دوسرے کے بھائی تھے اور سید آل نبی کے بیٹے تھے، دادا کا نام سید فرزند علی تھا، جنہوں نے پٹنہ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی، والد بزرگوار کا نام بشارت علی تھا، جن کی تاریخ پیدائش جنوری ۱۸۸۷ء / ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ بتائی جاتی ہے۔ (۵)

ولادت، ابتدائی تعلیم و تربیت: مولانا ریاست علی ندوی ۲ / صفر المظفر ۱۳۲۳ھ مطابق ۸ / اپریل ۱۹۰۴ء کو آبگلہ گیا میں پیدا ہوئے، گھرانا تعلیم یافتہ تھا، اس لیے ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر حاصل کی، کچھ ہوشیار ہوئے تو صاحب گنج ہائی اسکول گیا میں داخل کرائے گئے لیکن بدقسمتی سے چند دنوں بعد ہی ان کی والدہ انتقال کر گئیں، جس کی وجہ سے ان کا تعلیمی سلسلہ درہم برہم ہوگیا، اس کے بعد ان کے گھر والوں نے ان کو پٹنہ بھیج دیا جہاں انہوں نے تعلیم شروع کی لیکن یہاں بھی سکون نہیں تھا، اس لیے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں گھر سے بہت دور کسی اچھے دینی ادارے میں داخل کرایا جائے، تاکہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ حصول علم کر سکیں۔

ندوۃ العلما میں حصول علم: قرعۂ فال دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے نام نکلا جو اس وقت ملک کا مشہور و معروف دینی ادارہ تھا اور عربی ادب میں درجۂ اختصاص رکھتا تھا، وہاں انہوں نے ۱۹۱۶ء میں داخلہ لیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ حصول علم میں مشغول ہوئے اور آٹھ سال تک ندوۃ العلما سے اکتساب فیض کرتے رہے، ندوے میں انہوں نے دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کی ساتھ ہی ساتھ انگریزی حکومت کے خلاف سیاسی مسائل میں بھی دلچسپی لینے لگے، کیوں کہ اس زمانے میں وہ ندوۃ العلما کے ہاسٹل میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے لگے تھے، جو اس سے قبل مصر میں انگریزوں کے خلاف ایک متحرک اور فعال شخصیت کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور وہاں قانونی طور پر معتوب ہو کر اور واپس آکر ندوۃ العلما میں طالب علمی کی زندگی نہایت خاموشی کے ساتھ گذارنے لگے تھے، داخلہ شعبۂ تکمیل حدیث میں لے لیا تھا لیکن چوں کہ انقلابی آدمی تھے اور انگریزوں کے سخت مخالف تھے، اس لیے ندوۃ العلما میں آئے دن انگریزی حکومت کے خلاف اظہار خیال فرماتے اور اس کے سیاسی خیالات و نظریات پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے، رفتہ رفتہ مولانا ریاست علی ندوی بھی ان سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت کے سخت مخالف ہو گئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول مالک رام ''حکومت کے کارندے جو عبدالرزاق ملیح آبادی کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ خود ملیح آبادی تو خاموش ہیں، کہیں آتے جاتے نہیں لیکن ان کا یہ شاگرد ان کے بھی کان کاٹنے لگا ہے، قدرتاً یہ معتوب سرکار ہو گئے بلکہ سنا ہے کہ ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے تھے۔(۶)

عقد: یہ خبر گھر تک پہنچی تو گھر والوں نے انہیں ندوۃ العلما سے واپس بلا لیا، چند روز گذر گئے تو ان کی شادی کی فکر ہوئی، چنانچہ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر سید اکرم امام کی منجھلی صاحب زادی سعیدہ خاتون سے ان کا عقد کر دیا گیا، شادی کے بعد چند ماہ گھر پر رہے، اس مدت میں ان کی سیاسی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور غالباً وارنٹ بھی منسوخ کرا دیئے گئے تو وہ پھر ندوۃ العلما پہنچے تاکہ بقیہ تعلیم مکمل کر لیں، چنانچہ تین سال مزید رہ کر ۱۹۲۴ء میں وہ وہاں سے فارغ ہوئے۔(۷)

دار المصنّفین میں تصنیفی تعلیم و تربیت: علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) ۱۹۲۴ء میں

دارالمصنّفین کے ناظم تھے،جس کو قائم ہوئے ابھی چند برس ہوئے تھے،اس ادارے کوایسے اہل علم اور ہونہار طلبا کی ضرورت تھی جو اپنی علمی اور ادبی صلاحیت ،محنت وریاضت اوراعلا تصنیفی ذوق سے اس کے علمی معیار کو بلند کرسکیں اوراس کی عظمت ووقار کو بڑھا سکیں ،اس مقصد سے علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے علمی احباب اوراچھے طلبا کواس ادارے میں اکٹھا کرنا شروع کیا، ۱۹۲۴ء میں انہوں نے ندوۃ العلما سے دوایسے نو جوان عالموں کو تصنیفی تعلیم وتربیت کے لیے منتخب کیا جو اپنی علمی وادبی صلاحیت واستعداد کی بنا پر دیگر طلبہ کے درمیان ممتاز تھے، یہ دونوں نوجوان شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید ریاست علی ندوی تھے، ریاست علی ندوی نے دارالمصنّفین پہنچتے ہی لگن اور جوش وخروش سے کام کرنا شروع کردیا اور چند ماہ بعد ہی اپنا علمی مقام بنالیا اوراپنی محنت و لیاقت سے علامہ سید سلیمان ندوی کو بھی متاثر کیا،اس سلسلے میں سید صباح الدین عبدالرحمان (م ۱۹۸۷ء) جودارالمصنّفین میں ان کے ساتھ تھے،فرماتے ہیں:

''وہ ۱۹۲۴ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ ندوہ کی تعلیم ختم کرکے حضرت سید صاحب کی خواہش پر یہاں آئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سید صاحب کواپنی علمی ریاضت ومحنت سے متاثر کیا''۔(۸)

علمی خدمات: ۱۹۲۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے جب ان کو صلاحیت ولیاقت کے لحاظ سے پوری طرح موزوں خیال کیا تو انہوں نے اپنی نگرانی میں رسالہ معارف کی ترتیب کی خدمت ان کے سپرد کی ،جس کوانہوں نے خوش اسلوبی اور تندہی سے انجام دینا شروع کیا، وہ معارف کے لیے مفید اوراہم مضامین کی تلخیص کرتے اور جدید مطبوعات پر ریویو بھی کرتے ، جس کواہل علم عام طور پر پسند کرتے اوران کی دقت نظر اور علمی بصیرت کی داد دیتے ،اس زمانے میں رسالہ معارف میں باب الاستفسار قائم کیا گیا تا کہ قارئین معارف جوسوالات بھیجیں ان کے علمی وتحقیقی جوابات دیے جائیں، یہ خدمت بھی مولانا ریاست علی ندوی کے ذمہ سونپی گئی،جس کو انہوں نے پوری دلچسپی اور محنت سے انجام دیا، یہی وجہ ہے کہ چند برسوں میں علمی حلقوں میں ان کا اعتبار اور وقار قائم ہوا اور پھر علامہ سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنّفین کا رفیق اور معارف کا سب اڈیٹر بنادیا، جو علمی لحاظ سے ایک بڑا اعزاز تھا۔(۹)

مقالات: ان علمی خدمات کے علاوہ وہ معارف میں مقالات بھی لکھتے تھے جو خالص علمی و تحقیقی انداز کے ہوتے تھے، ان مقالات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا ہر مقالہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، کیوں کہ یہ بیشتر مقالے کئی کئی قسطوں میں چھپتے تھے اور علمی و تحقیقی معیار کے لحاظ سے اردو زبان کے اعلا درجہ کے مقالات میں شمار ہونے کے لائق ہوتے تھے، یہ مقالات تاریخ اسلام، تاریخ ہند، ادب اسلامی، طب جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔

وہ دارالمصنّفین میں اگست ۱۹۲۴ء تا جون ۱۹۳۷ء یعنی تیرہ سال رہے، اس عرصے میں انہوں نے مندرجہ ذیل مقالات تحریر فرمائے:

۱-عربوں کا علم طب شام میں (جون ۱۹۲۶ء)۔ ۲-فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ (جولائی تا دسمبر ۱۹۲۶ء)۔ ۳-ترکی ادبیات پر ایک اجمالی نظر (جون ۱۹۲۷ء)۔ ۴-امام غزالی اور حکمائے یورپ (اگست ۱۹۲۸ء)۔ ۵-ابن رشیق صقلیہ میں (اپریل، اگست، ستمبر ۱۹۲۹ء)۔ ۶-خان اعظم تاتار خاں (فروری ۱۹۳۲ء) ۷-کیا عالم گیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانونی جرم تھی؟ (مئی ۱۹۳۳ء)۔ ۸-ترجمان القرآن اور نجات و سعادت کی راہ (مارچ ۱۹۳۳ء)۔ ۹-اغلبیوں کا عدالتی نظام (دسمبر ۱۹۳۳ء)۔ ۱۰-سندھ کے اسلامی حملوں کے قیدی (مئی ۱۹۳۵ء)۔ ۱۱-سسلی میں مسلمانوں کا تمدن (ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۵ء)۔ ۱۲-صفی ہندی (مارچ ۱۹۴۳ء)۔ ۱۳-عالم گیر کے عہد میں مندروں کا انہدام (ستمبر ۱۹۴۳ء)۔ ۱۴-کتاب العشر والزکوٰۃ (اگست، ستمبر ۱۹۴۴ء)۔ ۱۵-عہد اسلامی کا ہندوستان (مئی تا جولائی ۱۹۴۹ء)۔

تصنیفات: مولانا ریاست علی ندوی نے دارالمصنّفین کے زمانۂ قیام میں تصنیف و تالیف کی طرف خصوصی توجہ دی تھی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو تصنیفات ہمارے لیے یادگار چھوڑی ہیں وہ اپنے علمی و ادبی مقام اور تحقیقی معیار کے لحاظ سے اردو زبان و ادب کی صف اول کی تصنیفات میں شمار ہوتی ہیں اور علمی و ادبی حلقوں میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی

ہیں، ان تمام تصنیفات میں دقت نظر، دیدہ ریزی اور محنت و جاں فشانی سے مواد اکٹھا کیا ہے، اسلوب بیان بھی سنجیدہ، علمی، سادہ اور خوب صورت ہے، جس کی وجہ سے تاریخ جیسے خشک موضوع کی کتاب بھی خشک کی بجائے دل چسپ اور دل کش ہوگئی ہے، انہوں نے دارالمصنّفین کے زمانہ قیام میں جو کتابیں لکھیں، وہ یہ ہیں:

۱-تاریخ صقلیہ (۲ جلدیں)۔ ۲-تاریخ اندلس۔۳-اسلامی نظام تعلیم۔۴-ائمہ اسلام۔۵-سرگذشت ادب ترکی۔

تاریخ صقلیہ: یہ مولانا ریاست علی ندوی کی سب سے اہم، شاندار اور قابل فخر تصنیف ہے جو دو جلدوں میں ہے اور ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

جزیرہ صقلیہ (Sicily) اپنے محل وقوع اور جغرافیائی لحاظ سے دنیا کی متمدن اقوام یعنی یونانیوں، رومیوں اور مسلمانوں کی حکمرانی کا جولان گاہ رہا ہے، یہاں کی اسلامی تاریخ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اسلام جس طرح اندلس کے راستے سے یورپ پہنچا، اسی طرح صقلیہ دوسرا راستہ ہے جس کے ذریعہ یورپ اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے پورے طور پر فیض یاب ہوا، مسلمانوں نے صقلیہ میں ساتویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی تک حکومت کی اور اس چارسو سالہ دور حکومت میں انہوں نے وہاں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی زندگی میں عظیم انقلاب برپا کرکے اسلامی زندگی نے ایسے گہرے نقوش چھوڑے کہ ان کے اثرات عرصے تک وہاں قائم رہے۔

حیرت کی بات ہے کہ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود اس شاندار اور اہم اسلامی حکومت کی کوئی جامع تاریخ دنیا کی کسی زبان میں مرتب نہیں ہوئی تھی، مولانا ریاست علی ندوی پہلے محقق اور دانش ور ہیں جنہوں نے دس سال کی مسلسل محنت وریاضت کے بعد یہ کتاب مرتب کی، جو اپنے مواد، تحقیق اور جدید اصول تحقیق کے لحاظ سے ایک جامع، مستند اور مثالی کتاب کہی جاسکتی ہے، انہوں نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی زبانوں میں موجود علمی مواد اور تاریخی حالات و واقعات کو انتہائی محنت و جاں فشانی اور دیدہ ریزی سے یکجا کرکے صقلیہ کے جغرافیہ، تاریخ، عربوں کی فتح مندی، مسلم حکمرانوں کے عہد بہ عہد کی اقتصادی، سماجی، سیاسی،

تمدنی تاریخ اور اس کے دور رس نتائج و اثرات پر پوری تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں تاریخی موضوع پر اردو زبان میں جو چند اہم اور قابل فخر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں یہ کتاب بھی شمار ہونے کے لائق ہے۔

تاریخ اندلس: یہ اندلس کی تاریخ پر ایک مستند اور معتبر کتاب ہے جو اپنی تاریخی و علمی تحقیق اور مواد کی فراہمی کے لحاظ سے تاریخ صقلیہ کے بعد دوسری اہم تصنیف قرار دی جاتی ہے، یہ کتاب دراصل چار جلدوں میں مرتب ہوئی تھی لیکن افسوس ہے کہ اس کی صرف پہلی جلد چھپ کر منظر عام پر آسکی جو ۱۹۵۰ء میں دارالمصنّفین سے شائع ہوئی، اس جلد میں اندلس کی ابتدائی تاریخ سے لے کر ۴۰۶ھ تک کی مفصل اسلامی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

اسلامی نظام تعلیم: یہ اسلامی نظام تعلیم پر ایک اہم اور مفید رسالہ ہے، جس میں نظام تعلیم سے متعلق علما کے تعلیمی نظریات و خیالات اور ان کی تصنیفات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، مصنف نے اپنے موضوع کی تائید و حمایت میں قدیم اور مستند مصادر و مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور نہایت قوی دلائل اور علما کے اقوال سے اپنا مدعا ثابت کیا ہے، یہ کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، ۱۳۵۷ھ میں دارالمصنّفین اعظم گڈھ سے اس کی اشاعت ہوئی، علمی و فنی لحاظ سے اس کتاب کی کیا اہمیت ہے، اس کے بارے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن (م ۱۹۸۷ء) کا بیان نہایت اہم ہے، فرماتے ہیں:

> ''اردو زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر شاید کوئی اور کتاب نہیں''۔(۱۱)

ائمہ اسلام: یہ مولانا ریاست علی ندوی کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو ۲۱ سال کی عمر میں لکھی گئی، امام ابن تیمیہؒ کی ایک مشہور کتاب رفع الملام عن ائمۃ الاعلام کے نام سے ہے، یہ کتاب دراصل اسی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جو نہایت عام فہم اور بامحاورہ ہے، اس کتاب میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اسلام نے انسانی عقل کے لیے نہایت وسیع فضا پیدا کی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس نے علمائے اسلام کو انسانی زندگی کے مسائل پر غور و خوض کرنے اور اسلامی تعلیم

کے دائرے میں انہیں حل کرنے کے لیے پوری ترغیب دی ہے، یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں الہلال ایجنسی لاہور سے شائع ہوئی۔

سرگذشت ادب ترکی: یہ ترکی ادب کی تاریخ پر ایک مختصر مگر نہایت جامع رسالہ ہے جو مصر کے مشہور انشا پرداز عالم شیخ محبّ الدین الخطیب مدیر الزہراء کے ایک بسیط مقالہ سے ماخوذ ہے، اس میں ترکی ادبیات کی ابتدائی تاریخ، ترکی شاعری کا آغاز، دور اسلامی میں عثمانیہ سلاطین کی سرپرستی، دوسرے دور میں یورپ کے ادبیات سے اثر پذیری اور پھر آخر میں دور حاضر کی ترکی ادبیات کی تاریخ نہایت خوب صورت اور دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے، یہ رسالہ ۱۹۳۳ء میں دار المصنّفین اعظم گڈھ سے شائع ہوا جو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

گھر کی واپسی: سید صباح الدین عبدالرحمان نے لکھا ہے کہ سید ریاست علی ندوی نے ۱۳ / برس علمی و تصنیفی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۳۷ء میں دار المصنّفین کو چھوڑ دیا اور گھر واپس آ گئے۔ (۱۲)

رسالہ ندیم کی نظامت وادارت: گھر آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے عہدہ کے خواستگار تھے، اس کے لیے انہوں نے ایک سال کی چھٹی بھی حاصل کی تھی لیکن حالات نے ساتھ نہیں دیا اور وہ پرنسپل نہ ہو سکے، طویل چھٹی لینے کی وجہ سے دار المصنّفین واپس جانے کا خیال بھی نہیں تھا، اتفاق سے اسی زمانے میں رسالہ ندیم جو گیا سے صوبہ بہار کے معروف مزاح نگار ادیب انجم مانپوری کی ادارت میں عرصہ سے نکل رہا تھا، ان کی طویل علالت کی وجہ سے اب وقت پر نکلنا دشوار ہو رہا تھا اور مالی اور انتظامی لحاظ سے اس کی حالت درست نہیں تھی، اس کی زندگی اور بقا کے لیے ایک تجربہ کار اور باصلاحیت صحافی کی ضرورت تھی، مولانا ریاست علی ندوی وہاں پہنچے تو انجم مانپوری اور دیگر اہل علم کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوگئی اور ان لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ اس کی ذمہ داری قبول کر لیں، مولانا ریاست علی ندوی نے اس کی علمی و ادبی ضرورت و اہمیت کو محسوس کر کے پیش کش قبول کر لی (۱۳) اور بڑے اہتمام اور جوش و خروش سے یہ پرچہ نکالنا شروع کیا، ان کی ادارت میں پہلا پرچہ اگست ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا، چونکہ وہ ایک تجربہ کار صحافی اور اعلا مصنف تھے، اس لیے انہوں نے اس کی طباعت و کتابت کا

معیار اونچا کیا، مضامین میں وسعت اور تنوع پیدا کی، اس کے مخاطب بہار اور اس کے اہل علم تھے لیکن اب اس کے قاری پورے ملک اور میں ہو گئے، ملک کے مختلف خطوں کے علمی، تمدنی، معاشرتی، تاریخی اور لسانی مسائل پر مضامین و مقالات شائع ہونے لگے اور اس کو انہوں نے اس رسالے کی اشاعت کا اہم مقصد قرار دیا، چنانچہ اگست ۱۹۳۷ء کے شمارے میں جوان کے زیر ادارت پہلا شمارہ تھا، شذرات میں لکھتے ہیں ''زمانہ اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے، ہندوستان کے مختلف خطوں میں علوم و فنون کی ترقی و خدمت کے لیے رسائل مہیا ہیں اور ہر خطۂ ملک کی مختلف تمدنی، معاشرتی، تاریخی اور لسانی خصوصیات ہوتی ہیں اور ان کی خدمت کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی خدمتیں دنیاوی عیش و عشرت اور نام و نمود سے بے نیاز ہو کر انجام دی جاسکتی ہیں اور ہم دماغی نشو و نما اور تعلیم و تربیت ہی کے ذریعہ وہ حقیقی بیداری پیدا کر سکتے ہیں جو ہمیں ترقی کی راہ پر لگا سکتی ہے، ہم سر دست ندیم کے ذریعہ اس دور دراز منزل کو طے کرنے کے لیے بہ طور پیش خیمہ روانہ ہوتے ہیں''۔

اس دور کے ندیم کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ شعری و ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ اعلا پایہ کے علمی و تحقیقی مضامین شائع ہونے لگے، اسلوب بیان نہایت سنجیدہ اور علمی تھا، مولانا ریاست علی ندوی گراں قدر موضوعات پر خود بھی مقالات لکھتے، تاکہ اس کا علمی و تحقیقی معیار بلند ہو سکے، ان کے چند اہم مقالات یہ ہیں:

۱- سید غلام حسین خاں مصنف سیر المتاخرین (رسالہ ندیم بہار نمبر)، (صوبہ بہار کا ایک نامور مورخ)۔ ۲- ہندوستان کے عہد اسلامی میں تعلیم کا نظام (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۳۷ء اور جنوری و فروری ۱۹۳۷ء)۔ ۳- عیدین کے مصالح اور ان کے مراسم اسلامی عہد میں (مارچ و اپریل ۱۹۳۸ء)۔ ۴- حضرت حسن بصری (جون ۱۹۳۸ء)۔

اس رسالے کی ادارت سنبھالنا بڑی ذمہ داری تھی، کیوں کہ گیا شہر علمی و ادبی لحاظ سے ایسا نہیں تھا جہاں ہر طرح کی علمی و ادبی سہولتیں مہیا ہوں، تاہم ایسے چھوٹے شہر میں اچھے پریس کو قائم کر کے اچھی کتابت و طباعت کے ساتھ پرچہ نکالنا اور پورے ملک سے اعلا اور گراں قدر مضامین فراہم کرنا اور ملک کے بلند پایہ رسائل کی سطح اور معیار پر لانا اہم اور غیر معمولی بات تھی،

مولانا ریاست علی ندوی نے یہ کارنامہ بخوبی انجام دیا، ظاہر ہے وہ اس رسالہ کو معارف کا مثنیٰ بنانا اور اس کے معیار پر لانا چاہتے تھے، ایسا کرنے میں وہ پورے طور پر کامیاب تو نہیں ہو سکے تاہم صوبۂ بہار میں ایک اعلا اور اونچی صحافت کی یادگار چھوڑ گئے، جس کو ملک کی علمی وصحافتی دنیا کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

دارالمصنّفین واپسی: ندیم چار سال یعنی ۱۹۴۱ء تک بڑی شان وشوکت اور دھوم دھام سے نکلتا رہا لیکن مالی مشکلات کم نہ ہوئیں اور صورت حال ایسی ہوئی کہ مولانا ریاست علی ندوی کے لیے اس کو جاری رکھنا ناممکن ہوگیا، اس لیے مجبوراً اس سے سبک دوش ہوگئے اور جنوری ۱۹۴۲ء میں دوبارہ دارالمصنّفین چلے گئے اور ۱۹۴۹ء تک وہاں سرگرم عمل رہے۔(۱۴)

مدرسہ شمس الہدیٰ کا منصب جلیل: مولانا ریاست علی ندوی مدرسہ شمس الہدیٰ کی پرنسپلی کے پہلے بھی خواہش مند تھے لیکن بوجوہ یہ خواہش تشنہ رہی، بالآخر مشیت ایزدی نے ساتھ دیا اور وہ نومبر ۱۹۴۶ء میں اس کے پرنسپل ہوکر پٹنہ آگئے اور تیرہ سال یعنی مارچ ۱۹۵۹ء تک اسی عہدے پر فائز رہے، اس مدت میں وہ انتظامی امور کے ساتھ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے رہے اور درجہ علیا کے طلبا کو علوم دینیہ کی تعلیم دیتے رہے لیکن انتظامی امور میں حد سے زیادہ سختی اور اپنے مخصوص سیاسی خیالات کی وجہ سے طلبا کو خوش رکھ سکے اور نہ اساتذہ کو، جس کے نتیجے میں وہ خود بھی پریشان رہے طلبا واساتذہ بھی غیر مطمئن رہے۔(۱۵)

دوسرے عہدے: اسی زمانے میں وہ ۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۲ء حکومت بہار کے شعبہ اسلامی تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی ہوئے اور جب مدرسہ شمس الہدیٰ کے عہدے سے علاحدہ ہوئے تو مارچ ۱۹۵۹ء میں عربی، فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کے صدر اور پروفیسر ہوگئے، جہاں وہ سات برس تک اس کے انتظامی اور تعلیمی امور کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہے، اس کے بعد گیا چلے گئے جہاں وہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے مگدھ یونی ورسٹی بودھ گیا میں ادبیات عربی اور اسلامیات کے پروفیسر بنائے گئے اور بہ حسن وخوبی اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔(۱۶)

دیگر تصنیفات: انہوں نے دارالمصنّفین کے زمانہ قیام میں جو کتابیں تصنیف کیں، ان کی تفصیل اوپر گزر چکی، وہ تقریباً بیس برس وہاں رہے، اس کے علاوہ وہ پٹنہ اور گیا کے مختلف اہم

عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور تعلیمی صحافتی اور انتظامی امور انجام دینے میں مصروف رہے، یہ ۳۱/ برس کی مدت پر محیط ہے جو دارالمصنّفین کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا زائد ہے لیکن افسوس ہے کہ اس طویل مدت میں انہیں تصنیف و تالیف کے لیے وہ خوش گوار علمی ماحول اور ذہنی یکسوئی حاصل نہ ہوسکی، جو دارالمصنّفین میں میسر تھی، اس لیے اس زمانے میں وہ کوئی قابل ذکر اور نمایاں تصنیف پیش نہیں کر سکے اور نہ کوئی اعلا اور وقیع علمی کارنامہ انجام دے سکے، تاہم علمی ماحول کے پروردہ تھے، ذہن و فکر کے لحاظ سے خالص علمی آدمی تھے، طبیعت پر علم غالب تھا، اس لیے کسی نہ کسی طرح علمی کام میں اپنے آپ کو لگائے رہتے اور تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے، جس کی جھلک پیش کی جارہی ہے۔

عہد اسلامی کا ہندوستان: انہوں نے دارالمصنّفین میں جو مقالات لکھے تھے، ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، اس میں وہی مقالات شامل ہیں جو اسلامی ہند کے تاریخی واقعات اور کاموں پر مشتمل ہیں، یہ کتاب ادارۃ المصنّفین پٹنہ سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی جو ۳۰۷/ صفحات پر محیط ہے۔

عہد رسالت و خلافت راشدہ: یہ ان کی اہم تصنیف ہے جو دور حاضر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو عہد اسلامی کے زریں دور رسالت کی تاریخ اور خلفائے راشدین کے صحیح حالات و واقعات بتانے کے لیے لکھی گئی ہے، مستند و معتبر ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، اس کا مسودہ مصنف نے خود ہی بہار اردو اکیڈمی پٹنہ میں طباعت کے لیے جمع کیا تھا لیکن اکیڈمی والوں نے کچھ دیر کی، یہاں تک کہ مصنف انتقال کر گئے، یہ کتاب ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۷ء میں اکیڈمی ہی سے شائع ہوئی۔

چند تنقیدیں: یہ مذہبی، ادبی، تاریخی موضوعات پر مختلف تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ہندوستان کے مختلف رسائل میں چھپے تھے، یہ کتاب بہار اردو اکیڈمی پٹنہ سے ۱۹۸۸ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

سیاسی افکار و خیالات: وہ زمانہ طالب علمی سے سیاسی ذہن رکھتے تھے اور سیاسی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ان کی سیاسی زندگی دراصل ندوۃ العلما کی طالب علمی

کے دور سے شروع ہوتی ہے، جب وہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جیسے انقلابی، فعال اور انگریز مخالف شخص کے ساتھ کئی سال تک ایک ہی کمرے میں رہتے تھے، ان کی صحبت نے ان کے سیاسی شعور میں پختگی، جواں مردی اور پائداری بخشی، یہی وجہ ہے کہ وہ اسی زمانے میں عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے خلاف انگریزی سرکار کی طرف سے وارنٹ جاری ہوا اور انہیں مجبور ہو کر تھوڑے دنوں کے لیے گھر واپس آنا پڑا۔

وہ دراصل انگریزی سرکار کے سخت مخالف اور کانگریس پارٹی کے پکے حامی تھے، کیونکہ اس زمانے میں کانگریس ہی ملک کی سب سے بڑی انقلابی سیاسی پارٹی تھی، جس میں ہندو مسلم سب مل کر سیاسی بیداری پیدا کررہے تھے اور انگریزی حکومت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، مولانا ریاست علی ندوی حصول تعلیم کے بعد ۱۹۲۶ء میں جب دارالمصنّفین پہنچے تو اپنے ساتھ سیاست بھی لے کر آئے، یہ بات مولانا سید سلیمان ندوی کے لیے ناگوار خاطر تھی کیوں کہ وہ دارالمصنّفین کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے اور اپنے کارکنان کی شمولیت کو بھی ناپسند کرتے تھے، چنانچہ سید صباح الدین عبدالرحمان نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''یہ زمانہ ہندوستان کی سیاست میں بہت ہی پرآشوب تھا، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش سے ہندوستان کی سیاست بہت ہی مکدر ہورہی تھی، سید صاحب دارالمصنّفین کو اس سیاسی الجھاؤ سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے مگر ریاست علی صاحب کھل کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، جو سید صاحب کو پسند نہ آیا''۔(۱۷)

میرے خیال میں یہی ذہنی وفکری کشمکش دارالمصنّفین کو خیرباد کہنے کا سبب ہوئی ہوگی، جب وہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل بن کر پٹنہ آئے تو اس وقت تک سیاسی دنیا میں اچھی طرح متعارف ہوچکے تھے اور ایک سچے کانگریسی نیشنلسٹ کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، مدرسہ شمس الہدیٰ مذہبی ادارے کی حیثیت سے لوگوں میں مشہور تھا، تعلیم بھی خالص دینی اور مذہبی دی جاتی تھی، طلبا اور اساتذہ کی فکری وعملی زندگی بھی خالص مذہبی تھی لیکن مدرسہ میں آتے ہی انہوں نے انتظامی امور میں زیادہ سختی شروع کی، عفو و درگزر کی جگہ دفتری انتظامی کارروائی کا طریقہ اپنایا، مزید یہ کہ سیاست کو مدرسہ میں داخل کیا، جس کو وہاں کے اساتذہ اور طلبا ناپسند

کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اور اساتذہ وطلبا کے درمیان آویزش بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ان کو پرنسپلی سے سبک دوش ہونا پڑا۔

معاصرین کے خیالات وآراء: مولانا ریاست علی ندوی کی زندگی کا سب سے قیمتی اور سنہرا دور دارالمصنّفین کا تھا، یہ جگہ ذہنی وفکری سکون اور علمی وادبی ماحول کے لحاظ سے نہایت اہم تھی، یہی وجہ ہے کہ وہ یہاں بیس برس رہے اور اس طویل مدت میں علمی وادبی کاموں میں مصروف رہے اور تصنیف وتالیف کی خدمت انجام دیتے رہے، حقیقت یہ ہے کہ علمی وادبی لحاظ سے یہیں ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی، پروان چڑھی اور ترقی کی آخری منزل تک پہنچی، جب ان کی کتابیں دارالمصنّفین سے چھپ کر منظر عام پر آئیں تو پورے ملک میں ان کی پذیرائی ہوئی اور ہر طرف سے ان کی علمی صلاحیت وقابلیت، محنت وریاضت اور تصنیفی خوبی کی داد دی گئی۔

کسی علمی آدمی کی شخصیت کو جانچنے کے لیے ایک معیار اس کی تصنیفی وتالیفی صلاحیت ہے، جس سے اس کی علمی عظمت وبرتری، فکری پرواز، زبان وبیان پر قدرت ظاہر ہوتی ہے، مولانا ریاست علی ندوی ایک اعلا پایہ کے مصنف تھے، ان کی تصنیفات کو پڑھ کر ہر شخص اس کی تصدیق کرسکتا ہے لیکن ان کے معاصرین نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور ان کی تصنیفات کے بارے میں جو تبصرے تحریر کیے ہیں وہ ان کے لیے سند کا درجہ رکھتے اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ذیل میں ایسے ہی چند خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

مشہور ادیب وانشا پرداز اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی (م ۱۹۷۷ء) نے ۱۹۴۰ء میں صوبہ بہار کا سفر کیا تھا، جس کے دوران انہوں نے یہاں کے متعدد عالموں اور ادیبوں سے ملاقاتیں کی تھیں، سفر کے تاثرات انہوں نے ''بہار کی بہار'' کے عنوان سے پیش کیے جو رسالہ ندیم کے بہار نمبر میں بھی شائع ہوئے تھے، مولانا سید ریاست علی ندوی کے بارے میں انہوں نے لکھا:

> ''مولانا سید ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے ندیم ورہبر ہیں، ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً ۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبدالرحمان بلگرامی مرحوم کے عزیز ومخصوص شاگردوں میں تھے''۔(۱۸)

مولانا ریاست علی ندوی کا انتقال ہوا اور اس کی خبر سید صباح الدین عبدالرحمان کو موصول ہوئی تو وہ نہایت رنجیدہ خاطر ہوئے کیونکہ انہوں نے عرصہ دراز تک دارالمصنّفین میں ساتھ رہ کر علمی کام کیا تھا، انہوں نے رسالہ معارف میں ''وفیات'' کے ذیل میں اپنے رنج وغم کا اس طرح اظہار کیا:

''گذشتہ مہینہ پٹنہ کے اخبار صدائے عام میں دارالمصنّفین کے ایک پرانے لائق خدمت گذار مولانا سید ریاست علی ندوی کی وفات کی خبر بڑے دکھ اور درد کے ساتھ پڑھی، اسی وقت ان کی اہلیہ کے نام ایک تعزیتی تار بھیجا، پھر ان کے صاحب زادے سید ارشد علی کا خط موصول ہوا، اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوا اور چالیس سال پہلے کی دارالمصنّفین کی صحبتیں یاد آگئیں، مولانا سید ریاست علی ندوی ۱۹۵۰ء میں یہاں سے مستقل طور پر چلے گئے مگر یہاں سے جانے سے پہلے دارالمصنّفین کی بزم دوشیں کی ایک روشن شمع وہ بھی تھے مگر آہ وہ بھی اب خموش ہے''۔(۱۹)

ان کی معروف کتاب تاریخ صقلیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرحوم نے ان دونوں جلدوں کو جس محنت و ریاضت سے لکھا ہے، وہ دارالمصنّفین کی علمی تاریخ کا ایک بڑا شاندار کارنامہ شمار کرنے کے لائق ہے، اس کو جن چند کتابوں پر ناز ہے، ان میں یہ دونوں جلدیں بھی شامل ہیں''۔(۲۰)

پروفیسر عنایت اللہ ہندوستان کے معروف اسکالر تھے، برلن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، مولانا ریاست علی کی تاریخ صقلیہ چھپی تو وہ پڑھ کر نہایت متاثر ہوئے اور رسالہ ندیم کے بہار نمبر ۱۹۴۰ء میں اس پر ایک بسیط مقالہ سپرد قلم کیا، ان کے ایک ایک جملے سے کتاب اور صاحب کتاب کے ساتھ غیر معمولی عقیدت ظاہر ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

''تاریخ صقلیہ اپنے حسن ترتیب، تفصیل بیان، اصابت رائے اور اصول تاریخ نویسی کی پابندی کے لحاظ سے شبلی اسکول کی بہترین تصانیف میں سے ہے...... آج تک کی مشرقی زبان میں اس درخشاں عہد کی ایسی تاریخ مرتب

نہیں ہوئی تھی، گویا مسلمانان صقلیہ کا تمام اسلاف پر ایک فرض تھا جو آج تک ادا
نہیں ہوا تھا، ہمارے لیے یہ امر موجب صد ناز و افتخار ہے کہ اس فریضہ ملی کی
ادائیگی ایک ہندوستانی صاحب علم کے ہاتھوں ہوئی اور اہل بہار اور بھی زیادہ
مستحق مبارک باد ہیں کہ ان کی خوش قسمتی سے یہ اعزاز و امتیاز ان ہی کے صوبہ
سے ایک نوجوان فاضل کے حصہ میں آیا''۔(۲۱)

جسمانی یادگار: ان کی جسمانی یادگار پانچ صاحب زادے ہیں، جو یہ ہیں:

سید اسد علی، سید ارشد علی، سید اشہد علی، سید امجد علی، سید شوکت علی، یہ ماشاء اللہ سب کے سب خوش وخرم اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔(۲۲)

بیماری: ان کا وطن آبگلہ ضلع گیا تھا، اس لیے زندگی کے آخری ایام وہیں گذار رہے تھے، اس دوران انہیں موتیا بند ہوگیا، جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے، آپریشن ہوا تو آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی، سید صباح الدین عبدالرحمان کو اس کی اطلاع ملی تو وہ نہایت خوش ہوئے اور مولانا ریاست علی ندوی سے اصرار کیا کہ وہ تاریخ اندلس کی دوسری جلد مکمل کر دیں، اس کے لیے وہ رضامند بھی ہو گئے تھے لیکن عارضۂ قلب بھی لاحق تھا، اس لیے دارالمصنّفین جانے کی ہمت نہ کر سکے۔

وفات: بالآخر ایک روز قلب کی حرکت تیز ہوئی، گھر والوں نے بلگرام اسپتال گیا میں بہ غرض علاج داخل کیا لیکن دل کی دھڑکن بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ اتوار ۱۴/ نومبر ۱۹۷۶ء کو اسی اسپتال میں انتقال پر ملال ہوا، اسی روز ان کی لاش آبگلہ لائی گئی اور وہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔(۲۳)

حواشی

(۱) یہ شہر گیا سے دو میل دور مشرقی جانب سادات کی ایک قدیم بستی ہے جس کی کوئی مستند اور مرتب تاریخ ہمیں نہیں ملتی، تاہم موجودہ بستی گیا سے چند فرلانگ کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں اس کی بوسیدہ قبریں، قدیم کھنڈرات اور ٹوٹی پھوٹی سنگی دیواریں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہاں ایک قدیم بستی تھی جو امتداد زمانہ کے

ساتھ اب اُجڑ گئی ہے اور ویران ہوگئی ہے، اس کی قدامت اور تاریخی اہمیت کے بارے میں مولانا ریاست علی ندوی نے دو باتیں تحریر کی ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ھ / ۱۳۸۰ء) کا ایک مکتوب ہے جو آبگلہ کے کسی بزرگ کے نام ہے اور وہ مکتوبات صدی جلد دوم میں موجود ہے، دوسرے امیر کبیر سید علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ / ۱۳۸۴ء) اور اہل آبگلہ کے درمیان مصاہرانہ رشتے قائم تھے (دیکھیے عہد اسلامی کا ہندوستان : ۳۰۴ - ۳۰۵)، ان دونوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بلاشبہ کہی جاسکتی ہے کہ آبگلہ آٹھویں صدی ہجری میں موجود اور علمی دور روحانی اعتبار سے معروف و ممتاز تھا لیکن افسوس ہے کہ آج وہ کھنڈرات میں بدل گیا ہے۔ (۲) کنز الانساب : ۳۲۳۔ (۳) رسالہ تحریر، دہلی، ج ۱۱، شمارہ ۱؛ اشراف عرب : ۲۱۶۔ (۴) رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۵) ایضاً۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً۔ (۸) بزم رفتگاں، ۲/ ۲۹۔ (۹) رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۱۰) بزم رفتگاں، ۲/ ۲۹؛ رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۱۱) بزم رفتگاں، ۲/ ۲۲۰۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۱۵) ایضاً، بزم رفتگاں، ۲/ ۲۳۰۔ (۱۶) رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۱۷) بزم رفتگاں، ۲/ ۲۳۰۔ (۱۸) رسالہ تحریر، بہار نمبر ۱۹۴۰ء، ص ۳۲۔ (۱۹) رسالہ معارف، نومبر ۱۹۷۶ء۔ (۲۰) رسالہ تحریر، بہار نمبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۳۴۔ (۲۱) بزم رفتگاں، ۲/ ۲۲۰۔ (۲۲) رسالہ تحریر، جلد ۱۱، شمارہ ۱۔ (۲۳) ایضاً۔

مولانا عبدالسلام ندویؒ کے ایک مداح
مولانا سعید انصاری اوران کے چند خطوط

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مولانا عبدالسلام ندوی (۱۶/فروری ۱۸۸۳ء/ ۴/اکتوبر ۱۹۵۶ء) علم وفضل کے اس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں حد امتیاز من وتو مٹ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عزت وشہرت، صلہ وستائش اور نام وری کو انہوں نے درخور اعتناء نہ کیا، دراصل وہ فنا فی العلم تھے، ان کی یہی خوبی انہیں ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، ان کے مداحوں نے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء- ۱۹۵۸ء) مولانا سید سلیمان ندوی (۱۹۸۴ - ۱۹۵۳ء) اور مولانا سعید انصاری (۱۶/فروری ۱۸۹۴ - ۱۴/اکتوبر ۱۹۶۲ء) جیسے اہل علم وکمال کا نام شامل ہے، ان کے فضل و کمال اور عظمت وبلند پائیگی کا اظہار واعتراف خاص طور سے کیا ہے۔

ان کے ممدوحین میں مولانا سعید انصاری کا نام سب سے نمایاں ہے، وہ خود بڑے پایہ کے عالم وفاضل شخص تھے، تصنیف وتالیف میں بڑی مہارت رکھتے تھے، متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، اردو وفارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی جس کے علاحدہ علاحدہ مجموعے شائع ہوئے، عربی زبان وادب پر ایسی قدرت ومہارت تھی کہ پروفیسر مارگولیتھ نے انہیں جمعیۃ آداب اللغۃ العربیہ لندن کا رکن منتخب کیا۔(۱)

دارالمصنّفین کے بالکل ابتدائی دور یعنی فروری ۱۹۱۶ء سے وابستہ ہوئے، تلامذہ شبلی مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کے بعد وہ پہلے شخص تھے جو دارالمصنّفین میں رفیق مقرر ہوئے اور اپنی علمی صلاحیتوں سے اس ادارے کو پروان چڑھانے

آواس وکاس کالونی، اعظم گڈھ۔

میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

دارالمصنّفین کا آغاز سیرت نبویؐ اور سیر الصحابہؓ کی تدوین سے ہوا، مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوۂ صحابہؓ و صحابیاتؓ جیسی بے مثال تصنیف سے اس سلسلہ کی داغ بیل ڈالی، ان کے اخلاص کا نتیجہ تھا کہ یہ سلسلہ ۱۴/ جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس منصوبے کی تین کتابیں سیر انصار دو جلدیں اور سیر الصحابیات مولانا سعید انصاری کے قلم سے نکلیں اور آج تک مقبول ہیں۔

انصاری صاحب ایک وقفہ کے ساتھ ۱۹۳۰ء تک دارالمصنّفین میں رہے لیکن مولانا عبدالسلام ندوی سے ان کی عقیدت کبھی کم نہ ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ اور بڑھتی گئی، سب سے پہلے انہوں نے ایک طویل قصیدہ لکھا جو ان کے مجموعہ غزلیات فارسی میں شامل ہے، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہماں عبدالسلام من، قوام من، امام من — بدم دارد دم عیسیٰ، بکف دارد ید بیضا
فلاطوں فن، مسیحا دم، ارسطو مغز، حافظ نغز — بحکمت ہست چوں یعقوب کندی پایہ اش بالا
بمنطق قطب شیرازی، حریف طوسی و رازی — بدانش نصر فارابی، بہ بینش بوعلی سینا
بہ سلطانی اردو ہم و دانش مند اعظم ہست — ہماں استاذ کامل، شبلی نعمانی دانا
ہمہ دان و ہمہ گیر و ہمہ فضل و ہمہ دانش — کہ افروزد چراغ عقل خود از علم الاسماء[۲]

یہ پورا قصیدہ عقیدت و محبت اور اعتراف کمالات سے پر ہے، صاحب شعر الہند کے متعدد باوشعرا سے روابط تھے لیکن شاید ہی کسی اور نے اس قدر پرزور خراج عقیدت پیش کیا ہو، جب کہ مولانا سعید انصاری نے نہ صرف نظم میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنے ایک مضمون میں جو شبلی کالج میگزین کے عبدالسلام نمبر میں شائع ہوا ہے، ان کی عظمت اور تبحر علمی کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ایک ہمہ داں عالم، فلسفہ مزاج مصنف، قادر الکلام انشاء پرداز کی حیثیت سے مولانا کے رشحات قلم نے علم و فن کے ہر شعبہ کو سیراب کیا، الٰہیات، عقلیات، عمرانیات، نفسیات، تفسیر، شان نزول، حدیث، فقہ، اصول، علم اسرار الدین، فلسفہ، منطق، کلام، تاریخ، سیرت، اسماء الرجال، فلسفہ تاریخ، فلسفہ مذہب، سائنس، معانی، بیان، بدیع،

عروض، تنقید، خطابت، شاعری، غرض علوم قدیمہ و جدیدہ کی تینوں شاخوں یعنی فنون حکمیہ، دینیہ اور ادبیہ میں سے بہ استثنائے ریاضی وطب کون سی شاخ ہے جس میں ان کا قلم رواں نہیں ہے؟ اپنے جامع الکمالات استاذ کی طرح وہ بھی اکثر علوم کے چمن آرا ہیں، اگر اسوۂ صحابہ اور سیرت عمر بن عبدالعزیز اسلامی کتب خانوں کی زینت بن سکتی ہیں تو انقلاب الامم کو بین الاقوامی ادب کی الماریوں میں بے تکلف سجایا جاسکتا ہے، یہاں پہنچ کر مولانا اردو کے اکثر مصنّفین سے علاحدہ ہوجاتے ہیں اور وہ ارسطو، کندی، فارابی اور ابن سینا کی صف میں نظر آتے ہیں''۔(۳)

اسی معرکہ آرا مضمون میں انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے اولیات کی نشان دہی بھی کی ہے، جو یہ ہیں:

۱- مولانا اس زمانہ کے مشاہیر میں پہلے شخص ہیں جس نے اپنے دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالا، وہ تمام عمر صرف علم وادب کی خدمت میں مصرف رہے۔

۲- وہ پہلے مصنف ہیں جس نے تصنیف کا کام باقاعدہ سیکھا! تمام ہندوستان میں ان کے علاوہ ایک شخص بھی نہیں ہے جو یہ کام باقاعدہ جانتا ہو۔

۳- ان ہی نے طلبائے ندوہ میں سب سے پہلے مضمون نویسی پر انعام پایا۔

۴- سب سے پہلے علامہ شبلی کا طرز تحریر اختیار کیا اور سب سے زیادہ کامیاب رہے۔

۵- سب سے پہلے علامہ مرحوم کے رسم خط کی تقلید کی اور سب سے زیادہ ان سے مشابہ خط لکھا۔

۶- ان ہی نے سیر الصحابہؓ کی داغ بیل ڈالی۔

۷- ان ہی نے صحابہ کرامؓ کے کارناموں پر تبصرہ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

۸- شعر الہند میں تنقید و ترتیب کا نیا انداز نکالا جو شعر العجم سے بالکل الگ ہے۔

۹- وہ فطرتاً ادیب و شاعر پیدا ہوئے۔(۴)

مولانا عبدالسلام ندوی نے جب وفات پائی اس وقت مولانا سعید انصاری لاہور میں دائرہ معارف اسلامیہ کے شعبہ اردو سے وابستہ تھے، یہاں انہوں نے علامہ شبلی کی یاد میں ایک ادارہ شبلی مرکز قائم کیا جو پہلے ٹمپل روڈ پر تھا پھر کہیں اور منتقل ہوگیا، اس کے تحت انہوں نے ایک

مکتبہ بھی قائم کیا، جس میں دارالمصنّفین اعظم گڈھ، انجمن ترقی اردو کراچی اور جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی مطبوعات دستیاب تھیں، شبلی مرکز لاہور سے انہوں نے ایک سہ ماہی رسالہ ''شبلی'' کے نام سے جاری کیا، جس کا ذکر شبلی مرکز کے لیٹر ہیڈ پر بطور اشتہار موجود ہے، یہ اشتہار اس طرح ہے ''شبلی-شبلی مرکز لاہور کا علمی وادبی سہ ماہی رسالہ، جواپریل، جون، جولائی، ستمبر، اکتوبر، دسمبر، جنوری، مارچ میں پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے''۔

یہ اشتہار محض اشتہار ہی رہا یا رسالہ شائع ہوا، اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، یقین ہے کہ اگر یہ شائع ہوا ہوتا تو اس کی کاپیاں دارالمصنّفین میں ضرور محفوظ ہوتیں، اب اس کے بارے میں لاہور کے اہل قلم ہی قطعی طور پر کوئی بات کہہ سکتے ہیں کہ آیا یہ رسالہ شائع ہوا یا نہیں، اسی طرح یہ سوال کہ شبلی مرکز کب قائم ہوا اوراس نے کیا خدمات انجام دیں اوراس سے کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں تحقیق طلب ہے، راقم کواس مرکز سے کم از کم مولانا سعید انصاری کے فارسی کلام ''غزلیات فارسی'' کی اشاعت کا علم ہے، جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔

مولانا سعید انصاری مولانا عبدالسلام ندوی کا قصیدہ اور مضمون لکھنے کے بعد ان کی مکمل سوانح عمری ''حیات عبدالسلام'' کی طرف متوجہ ہوئے اوراس کا خاصا حصہ لکھ ڈالا جیسا کہ ان کے ایک خط سے جو مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب کے نام ہے پتہ چلتا ہے، مولانا اصلاحی مولانا عبدالسلام ندوی کے بھتیجے اور مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز فرزند ہیں اوراپنے چچا ہی کی طرح اخلاص اور شرافت ومروت کے پیکر ہیں، مولانا عبدالسلام ندوی کے بعض نجی اور خاندانی احوال کے لیے مولانا سعید انصاری نے انہیں خطوط لکھے جواب اصلاحی صاحب کی عنایت سے میرے پاس محفوظ ہیں، یہ کل پانچ خط ہیں جو ۲؍ مارچ ۱۹۵۹ء سے یکم جولائی ۱۹۵۹ء کے دوران لکھے گئے ہیں، طوالت کے باوجود یہ خطوط یہاں نقل کیے جاتے ہیں تا کہ یہ محفوظ ہوجائیں اور آیندہ حیات عبدالسلام لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوں اوران سے یہ اندازہ کیا جاسکے کہ مولانا عبدالسلام ندوی پراب تک جو کام ہوا ہے، اس میں وہ کون سے پہلو ہیں جن کی طرف توجہ نہ دی جاسکی یا جناب ہارون اعظمی صاحب جو مولانا کے فکر وخیال اوران کے علمی کارناموں کے فروغ واشاعت کے لیے مسلسل تندہی کے ساتھ کوشاں ہیں، وہ ان کی طرف توجہ دیں اور مکمل

''حیات عبدالسلام ندوی'' شائع ہوسکے۔

(۱)

شبلی مرکز لاہور

۲/مارچ ۱۹۵۹ء

مکرمی! السلام علیکم

مجھے مولوی انیس احمد صاحب سے آپ کا نام معلوم ہوا، مولوی عبدالسلام صاحب سے جو آپ کا رشتہ ہے اس کے لحاظ سے اگر کچھ تکلیف دی جائے تو بیجا نہ ہوگا، مجھے مولانا کے دادیہال اور نانہال کے نسب ناموں کی ضرورت ہے، براہ راست سلسلوں کے علاوہ دادی، پردادی، نانی، پرنانی وغیرہ کے نام اور نسب نامے بھی اگر بھیجیں تو مزید عنایت ہوگی۔

مولانا کی سوانح عمری میں اور بھی بہت سی باتیں دریافت کرنے کی ہیں جو وقتاً فوقتاً پوچھتا رہوں گا، سوانح کا خاصہ حصہ ہوگیا ہے، آپ بھی ان کے ذاتی حالات کی نسبت اگر کچھ بھیجتے ہیں تو کیا اچھا ہو، جو باتیں لینے کے قابل ہوں گی کتاب میں آپ کے حوالہ سے شامل کرلی جائیں گی۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا، رشید صاحب سے سلام کہیے گا اگر وہاں رہتے ہوں۔

والسلام سعید انصاری

(۲)

شبلی مرکز لاہور

۳۰/مارچ ۱۹۵۹ء

برادرم

کل کی ڈاک سے لفافہ ملا، نہایت خوشی ہوئی، ایک مشکل یعنی دادیہالی نسب کی حل ہوئی لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ علاء الدین جن کے نام سے گاؤں آباد ہوا مولانا کے مورثوں میں تھے یا نہیں؟ محمد صدیق صاحب زیادہ سے زیادہ اکبر کے زمانہ میں ہوں گے، کیا علاء الدین اگر وہ مورث تھے، ان سے بھی اوپر تھے؟ اور تھے تو کتنی پشت اوپر؟ یہ گاؤں کب آباد ہوا؟

اگر وہاں کا پہلا ''واجب العرض'' جو غدر سے پہلے داخل کیا گیا تھا مل جائے تو یہ بات صاف ہو جائے، کیوں کہ اس میں سب ہوگا، اخلاق احمد اپنے کو قریشی لکھتے ہیں! مولانا سے میں نے کچھ نہیں سنا، کیوں کہ کبھی پوچھا نہیں، اس پر بھی روشنی ڈالیے گا۔

مولانا کا ننہال جیراج پور ہے، اس لیے مولوی محبوب الرحمان اور مولانا اسلم کو ملا کر سب شاخوں کا نسب نامہ بھیجئے اور یہ بھی کہ یہ لوگ کس خاندان کے ہیں؟

مولانا کی نانی اور دادی کا نام آپ نے لکھا لیکن ان کے آگے کا نسب کم از کم باپ کا نام اور خاندان اور گاؤں آپ نے نہیں لکھا، اس کی بھی تصریح فرمائیے، یہ چیزیں اگر اس وقت چھوڑ دی گئیں تو آیندہ کوئی بتانے والا نہ ملے گا، جیراج پور میں میرا اب کوئی شناسا نہیں، ورنہ آپ کو تکلیف نہ دیتا۔

مولانا کی پیدائش کی تاریخ، دن، چاند کا مہینہ یا انگریزی تاریخ، ان کی عمر جب وہ کان پور گئے، مولوی محبوب الرحمان کے بی-اے کرنے کا سال (اگر برابر پاس ہوتے گئے ہوں) مولانا کی عمر شادی کے وقت، شادی کا سنہ، اخلاق کی پیدائش کا سنہ وغیرہ بھی تحریر فرمائیں۔

والسلام سعید انصاری

(۳)

شبلی مرکز لاہور

۱۱/ مئی ۱۹۵۹ء

برادر عزیز۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کارڈ ملا، علالت کی خبر پڑھ کر تشویش پیدا ہوئی، کیا بیماری ہے؟ امید ہے کہ اب اچھے ہوں گے۔

۱- مولوی شبلی صاحب متکلم سے تو ملاقات ہوتی ہوگی، وہ مولوی صاحب کے ساتھی ہیں، آپ ان سے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک تمام اساتذہ اور ان سے متعلق کتابوں کے نام دریافت کریں تا کہ پتہ چلے کہ مولانا نے کن کن استاذوں سے کیا کیا کتابیں پڑھیں؟ اور ندوہ میں

کن کتابوں سے ابتدا کی؟

۲-عبدالحکیم صاحب سے بندول میں یہ پوچھیے گا کہ علامہ مرحوم کے انتقال کے وقت مولوی حمید صاحب اور سید صاحب تو تھے مولوی مسعود تھے یا نہیں؟ مولوی عبدالسلام صاحب کب آئے؟

۳-جیراج پور میں اگر کوئی بتانے والا یا والی یہ بتا سکے کہ مولانا کی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ چاند کے حساب سے یا انگریزی کیا تھی؟

باقی باتیں لکھ چکا ہوں، ''عبدالسلام نمبر'' نہیں کتابچہ شائع ہوا سب سے بہتر مضمون میرا تھا، اس کی جو گت بنی آپ کو معلوم ہوگی، باقی مضامین میں دونا اہلوں کے اور دو نجس خبیثوں کے ہیں، اس سے اچھا تھا کہ یہ رسالہ نہ نکلتا، وہ نہایت پاک انسان تھے، ناپاک مضامین ان کے حسب حال نہیں، امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے، مولوی انیس صاحب سے کل ملاقات ہوئی تھی، آپ کا تذکرہ بھی آیا۔

ہاں مقصود کے پاس مولانا کی چھڑی اور ٹوپی ہے، میں نے مانگی تھی انہوں نے کہا تھا بھیج دوں گا لیکن وہ لا پتہ ہیں، بندول میں ملیں تو لے لیجیے گا، مولانا کے کپڑے وغیرہ جاہلوں نے فقیروں کو دے دیے، مجھے ملتے تو یہاں میوزیم میں رکھا دیتا، مہینوں سر مارا نتیجہ نہ نکلا، یہ سب جہالت کا کرشمہ ہے بڑے آدمی کو پہچانتے نہیں۔

والسلام سعید انصاری

(۴)

شبلی مرکز لاہور

۷/جون ۱۹۵۹ء

مکرمی سلام علیک

کل کارڈ ملا خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا، کیا اخلاق کا تبادلہ پونہ میں ہوگیا ہے؟ ان کا پتہ لکھیے گا، اگر وہ آخر جون تک رہیں اور عید میں آپ گھر جائیں تو ان سے مولانا کی غزلیں لے کر مجھے بھیج دیجیے، اب شاعری پر تبصرہ کرنا ہے، بقیہ دریافت طلب امور بھی جلد لکھ کر بھیجئے

اور مقصود سے چھڑی اور ٹوپی وصول کیجیے۔

شمیم آپ کے چچازاد بھائی کیا کرتے ہیں؟ اوران کا پتہ کیا ہے؟ مولانا شبلی متکلم کا پتہ کیا ہے؟ ان سب سے اب خط وکتابت کرنا ضروری ہے، اکیلے اخلاق کافی نہیں وہ صدیوں جواب میں ٹال جاتے ہیں۔

اخلاق کے بچوں کو دعا کہیے گا اور ابوالاحرار وغیرہ کو بھی یہ بتایئے کہ مولانا کے ایک چچا بہت سیاہ فام تھے انہوں نے ''العجاج الشجاج'' (طویل نام ہے) ایک کتاب لکھی تھی، ان کا نام کیا تھا؟ میں نے ان کو دیکھا ہے لیکن نام نہیں جانتا۔

سید امداد علی مولانا کے ابتدائی استاد، کیا قاضی عبدالرحمان حیرت مدرس جارج اسکول اعظم گڈھ کے چچا تھے؟ اگر نہ تھے تو حیرت صاحب کے چچا کا کیا نام تھا جنہوں نے مولانا کو پڑھایا تھا؟

''عبدالسلام نمبر'' بہت مایوس کن رہا، میرا مضمون جو سب سے اچھا تھا سازش کی نذر ہوگیا، میری فارسی غزلیات مدرسہ میں ہوں گی، ان کو دیکھیے، مولانا کی شان میں ایک قصیدہ ہے، اس کو پڑھا کیجیے، امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

سعید انصاری

شعبہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

(۵)

شبلی مرکز لاہور

۱/جولائی ۱۹۵۹ء

برادرم السلام علیکم

۱-تبرکات کا شکریہ قبول فرمایئے ، یہ نعت غیر مترقبہ آپ کی بدولت مجھے ملی، مولانا کے انتقال کے زمانہ میں اگر میں وہاں ہوتا تو چارپائی، بستر، کپڑے کوئی چیز بھی اعزہ کو نہ دیتا، وہ سب چیزیں کہیں محفوظ کردی جاتیں، مگر خیر، جو کچھ ہوا، ہوا۔

۲- کبیر احمد جائسی کے پاس ان کا ایک مضمون ''حدیث، استہزائے منکرین حدیث اور انکار حدیث مہدی آخرالزماں'' پر ہے، اس کو کسی ترکیب سے منگوا کر میرے پاس بھیج دیجیے، جائسی اس رسالے پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں مگر وہ کیا لکھیں گے ''عبدالسلام نمبر'' میں سب کی قابلیت دیکھ لی۔

۳- مولانا کا دادیہال اور نانہال کیا راج پوت ہے؟ اگر یہ بات ہے تو شیخ کیوں لکھتے ہیں؟ ریحمن ، مولانا کی دادی کہاں کی رہنے والی تھیں؟ حیات اللہ نام تھا یا حیات علی؟ نصیر الدین یا ناصرالدین؟

۴- کیا آپ کے مدرسہ میں الندوہ (۱۹۰۶ - ۱۹۱۴ء) کی فائل ہے؟ یہاں کے لوگ حدیث العہد بالاسلام ہیں، اس لیے الندوہ وغیرہ نہیں جانتے ! مجھے مولانا کے مضامین کی فہرست چاہیے، الندوہ اگر ہو تو مطلع کریں تاکہ فہرست بنانے کا طریقہ لکھ بھیجوں، معارف سے بنالی ہے اور الہلال سے بھی، اب الندوہ اور البلاغ سے بنانا ہے۔

۵- مولوی شبلی سے مولانا کے اساتذہ کے نام چاہیے، کس استاذ سے کس سنہ میں کون سی کتاب پڑھی؟ یہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک چاہیے اور کیا کیا علوم ندوہ میں پڑھے؟ آگرہ اور غازی پور میں کہاں تک پڑھایا تھا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فاروق صاحب سے کچھ نہیں پڑھا، مولانا طیب نے عرب سے ادب پڑھا، کیا یہ صحیح ہے؟

۶- دستار بندی ۱۹۱۰ء میں کہاں ہوئی؟ امتحاناً جو عربی کا مضمون جلسہ میں بیٹھ کر لکھا تھا کیا کہیں دارالعلوم ندوہ کے فائلوں میں ہوگا؟

۷- غالباً ۱۹۱۰ء میں شبلی جارج اسکول کے جلسہ تقسیم اسناد میں بورودنواب عبدالمجید و نواب محمد یوسف جو ترکیب بند فارسی میں پڑھا تھا اس کی نقل نواب یوسف کی کوٹھی سے مل سکے گی؟ (غالباً گورکھ پور کے باشندے ہیں!) یا اسکول کے فائلوں میں ہوگی؟

۸- شیخ دین محمد صاحب اور ان کی والدہ کی وفات کب ہوئی؟

۹- اخلاق کے پرنسپل ہونے کی خبر سے خوشی ہوئی، ظالم نے سارا خط خود لکھا مگر سلام ندارد، عجب بدحواس آدمی ہے۔

والسلام　　　سعید انصاری

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سعید انصاری ''حیات عبدالسلام'' کا زیادہ حصہ قلم بند کر چکے تھے اور مولانا مرحوم کے خانوادے کے ایک ایک فرد سے رابطہ قائم کر کے اسے مزید جامع بنانا چاہتے تھے تاکہ حیات عبدالسلام ہر طرح سے مکمل طور پر شائع ہو، دوسری بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ اس وقت تک مولانا مرحوم پر جو کام ہوا تھا اس سے وہ مطمئن نہ تھے اور نہ اسے ان کے شایان شان تصور کرتے تھے، ان خطوط کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بھی مولانا پر جو مضامین و مقالات سپرد قلم کیے گئے ان میں بہت سی باتیں جو مولانا سعید انصاری قلم بند کرنا چاہتے تھے وہ رہ گئیں، مثلاً مولانا عبدالسلام ندوی ندوی کے گاؤں علاء الدین پٹی کی اجمالی تاریخ، ابتدائی حالات اور تعلیمی احوال وغیرہ۔

ایک خط میں انہوں نے عبدالسلام نمبر اور اس کے مضمون نگاروں پر بڑی تند و تیز تنقید کی ہے جو مولانا عبدالسلام ندوی سے ان کی بڑھی ہوئی عقیدت کا مظہر ہے، دراصل وہ مولانا کے بہت بڑے عقیدت مند تھے اور ان پر کسی قسم کی تنقید یا ان کے مقام و مرتبہ میں کسی قسم کی کمی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، سچ تو یہ ہے کہ ان سے بڑا مداح عبدالسلام ندوی اب تک پیدا نہیں ہوا۔

ضرورت ہے کہ مولانا سعید انصاری کے مسودہ حیات عبدالسلام ندوی کی تلاش کے لیے تگ و دو کی جائے، ممکن ہے لاہور میں وہ کہیں محفوظ ہو؟ یقیناً یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم اور مفید کام ہوگا جس سے مولانا عبدالسلام ندوی کی حیات و خدمات، افکار و خیالات اور ان کے مقام و مرتبے کی تعیین میں مدد ملے گی۔

حوالے

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ''مولانا سعید انصاری نشتر''، ماہنامہ معارف، اگست ۲۰۰۸ء۔

(۲) سعید انصاری، غزلیات فارسی، شبلی مرکز، لاہور، ۱۹۵۶ء۔

(۳) شبلی کالج میگزین، اعظم گڈھ، ۵۹-۱۹۵۸ء، ص ۲۶-۲۷۔

(۴) ایضاً۔

پہلا صلیبی سامراج (۱)
چند فراموش شدہ تاریخی حقیقتیں

جناب عبدالمتین منیری

نشأۃ ثانیہ کے اپنے ابتدائی دنوں میں یورپی ملکوں میں دواؤں کی شیشیوں میں یہ عبارت خاص طور پر درج کی جاتی تھی کہ یہ ہندوستان سے یا دیار عرب سے درآمد کی ہوئی ہے، یہ تحریر بہت سے مہم جویوں اور دولت کے متلاشیوں کے جذبہ کو ابھارتی تھی اور انہیں مشرق سے آنے والی بعض اشیاء مثلاً مصالحہ جات اور عطریات وغیرہ کی اصل سرزمین کی تلاش اور وہاں کے سفر پر اکساتی تھی۔

اس دور کے جغرافیائی حالات پر تحقیق کرنے والے ایک محقق پانیکار نے مصالحہ جات میں سے ایک اہم عنصر سیاہ مرچ کی اس زمانے میں قدر و قیمت کے بارے میں درست لکھا ہے کہ اب شاید سیاہ مرچ کی کاروباری لین دین میں زیادہ اہمیت نہیں رہی لیکن (یورپ میں جغرافیائی انکشافات کے اس) دور میں یہ اپنی قدر و قیمت میں قیمتی پتھروں کے ہم پلہ تھی، اس کے لیے لوگ سمندروں کے خطرات مول لیتے اور سیاہ مرچ کے لیے مرتے اور مارتے تھے۔(۱)

ایک دوسرے محقق نے کالی مرچ کی اس اہمیت کو بیان کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ دیار روم میں پیش آنے والی جملہ جنگوں کے پس پردہ کارفرما وجہ ملبار کی کالی مرچ اور اس کی منڈیوں پر قبضہ کی چاہت تھی، اس چھوٹے سے کالے دانے نے ابتدائی عیسوی صدیوں میں دنیا کی نظریں اپنی طرف کھینچ لی تھیں۔(۲)

ایک دوسری حقیقت جو دورِ وسطیٰ کے یورپ میں جسے ہم دورِ ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں،

دبئی، یو، اے، ای۔

یہ ہے کہ مصالحہ جات کے بارے میں یہاں کے باشندوں کا یہ عمومی اعتقاد تھا کہ مصالحہ جات اور قیمتی پتھر جنت عدن سے آتے ہیں، انہیں چار نہریں دنیا میں لاتی ہیں، جغرافیہ دان اپنے نقشوں میں اسے ایک گول دائرہ اور نصف دائرہ کی شکل دے کر وثوق سے بتاتے تھے کہ یہ جنت یہاں واقع ہے، ان کا اعتقاد تھا کہ یہ جنت مشرق میں ایک بہت اونچی ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں سے چاند کو چھوا جاسکتا ہے، اسے چاروں طرف سے اونچی چہار دیواری گھیرے ہوئے ہے، جنہیں ہرے درختوں کے پتوں نے گھیر لیا ہے، پھر اس کے اطراف میں قلعے ہیں۔(۳)

ہمیں معلوم نہیں کہ اس کہانی کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما تھے، ہوسکتا ہے اس کا سبب اہمیت جتلا کر اس کی تجارت کو بڑھاوا دینا ہو، کیوں کہ اس دیومالائی ادبی خیال نے مصالحہ جات اور قیمتی پتھروں کی قیمتیں بہت بڑھادی تھیں، یہاں تک کہ دور وسطیٰ میں ''مرچ کی طرح مہنگی'' ضرب المثل عام ہوگئی تھی، اس زمانے میں فرانس وغیرہ کے کلیساؤں میں زمین اور زکاۃ کا ٹیکس مصالحہ جات کی صورت میں طلب کرنا عام سی بات تھی، اس دور میں غلاموں اور باج گزاروں کو اپنی آزادی خریدنے کے لیے کلیسائی آقاؤں کو ایک رطل کالی مرچ دینی پڑتی تھی، دوسری جانب یورپ کے زمین دارانہ دور میں مقررہ مقدار میں کالی مرچ کاشت کاری کی زمین کے کرایہ کے طور پر ادا کرنی پڑتی تھی۔(۴)

الف لیلہ میں عرب سندباد جہاز راں کے قصوں نے مشرق میں مصالحہ جات کی جگہوں ان کی تجارت اور ان تک پہنچنے کے لیے درپیش مہم جوئی کی تکلیفوں کے بارے میں روایات، خیالات بلکہ خرافات کو بڑھاوا دیا، یہیں سے مصالحہ جات کی تجارت نے بین الاقوامی روابط اور تعلقات کو جنم دیا اور تاریخ کے مختلف ادوار اور دور وسطیٰ میں انہوں نے حلقہ وصل کا کام کیا، یہیں سے مسلسل مشرق و مغرب کے مابین تعلقات کی کڑیاں ملتی ہیں، وہ اس طرح کہ جن راستوں سے قافلے مشرق سے مصالحہ جات لے کر جاتے تھے وہ ایشیا کو افریقہ سے ملانے والی اہم راہیں بن گئیں اور وہ اشیا جو اپنے اندر خوشبو اور خوش ذائقہ رکھتی تھیں اور اسی مناسبت سے انہیں عطارہ کی اصطلاح میں سمودیا گیا تھا کئی صدیوں تک مشرق و مغرب کے مابین تبادلہ کی اہم چیز بن گئیں۔

یہ اشیا جن مشرقی ممالک اور شہروں اور بندرگاہوں سے گزرتیں انہیں مالا مال تو کردیتیں

لیکن جہاں ان کی پیداوار ہوتی اوران کی تجارت ہوتی وہاں کے باشندوں کے لیے یہ مصیبتیں بھی لے آتیں ، یہ مصیبتیں آنی اس وقت شروع ہوئیں جب پوپ اربن دوم (Pope Urban II, 1042 - july 29, 1099) نے ۱۰۹۵ء میں فرانس کے شہر کلیر مونت میں ایک بڑے مجمع کے سامنے مغربی یورپ کے باشندوں کودعوت دیتے ہوئے اعلان کیا کہ یہ خدا کی مشیت ہے کہ لوگ اب اٹھ کھڑے ہوں ، اب صلیب اٹھا کر مقدس مقامات پر قبضہ کرنے اور انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھیننے کا وقت آ گیا ہے ،اس کے بعد ہی عربی اسلامی سلطنتوں کے خلاف یورپ کی صلیبی جنگیں شروع ہوگئیں اور جب اس دعوت مبارزت کو مغرب کے عیسائیوں کی تائید حاصل ہوگئی تو گویا صلیب کی لکڑی کو اٹھانے اور پوپ اربن دوم کی للکار کو لبیک کہنے کی ایک دوڑ شروع ہوگئی ، اس حربی پکار کے نعروں نے گیارہویں صدی عیسوی میں عالم عرب و اسلام میں صلیبی یورپی توسیع پسندی کی داغ بیل ڈالی ، جہاں ان جنگوں سے یورپ کو فتوحات ملیں وہیں ان پر تجارتی فروغ اور وسعت کے افق بھی کھل گئے ۔

۴۸۹ھ/ ۱۰۹۶ء سے ۶۹۰ھ/ ۱۲۹۱ء تک جملہ دوصدیوں کو پہلی صلیبی جنگوں کا دور بتایا جاتا ہے ،اس دوران یعنی ۴۹۳ھ/ ۱۱۰۰ء سے ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء تک اور صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں صلیبیوں کے شکست کھانے تک جملہ (۸۶) سال بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا،ان صلیبی جنگوں سے یورپ کے عیسائیوں کا کیا فائدہ ہوا،اس بارے میں فاضل مورخ ویل ڈورنٹ (Will Durant) یوں رقم طراز ہے:

''صلیبی جنگوں نے مسلمانوں کے تجارتی وصنعتی طریقہ کار کو جاننے کے بعد یورپ والوں میں پھرتیلے پن اور چستی کی روح بھردی ، کیوں کہ ان جنگوں سے انہیں سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف شہروں کے جائے وقوع سے انہیں آ گاہی حاصل ہوئی ، اطالوی تاجروں نے صلیبی جنگوں کے طفیل بحر متوسط کی گزرگاہوں کے نقشے بنانا سیکھ لیا، جوراہب ،مورخ اور خبر نویس صلیبی فوج کے ہم راہ تھے انہوں نے ایشیا کے ملکوں کی وسعت اوران کے مختلف علاقوں کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کر کے اپنے لوگوں تک پہنچائیں ،جس سے ان کے دلوں میں ان علاقوں کی دریافت اور یہاں تک پہنچنے کی کشش پیدا ہوئی ، اس طرح (عیسائیوں کے)

بلاد مقدسہ (فلسطین) کا سفر کرنے والوں کی یہاں کے مقدس مقامات کے زائرین کی رہنمائی اور یہاں کی ریاستوں اور شہروں کی تفصیلات بیان کرنے والی کتابیں منظر عام پر آئیں، عیسائی طبیبوں نے یہودی اور مسلمان طبیبوں سے علم طب حاصل کیا، صلیبی جنگوں کے طفیل یورپ میں علم جراحت ترقی پذیر ہوا، اس طرح تجارت اور کاروبار صلیب کے زیر سایہ اور پیچھے پیچھے چلتے رہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صلیب کی قیادت تجارت نے کی ہو، پیدل اور شہ سوار صلیبی فلسطین میں مسلمانوں سے تو ہار گئے لیکن اطالوی بحری بیڑے نے بحر متوسط کو نہ صرف مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لیا بلکہ بیزنطینیوں سے بھی اس کا قبضہ لے لیا، یہ درست ہے کہ شہر وینس، جنوہ، پیزا، املفی، مرسلیا، برسلونہ صلیبی جنگوں سے پہلے ہی مشرق کے مسلم ملکوں سے تجارت کرتے اور تنگنائے باسفور اور بحر اسود کو چیرتے آئے تھے لیکن صلیبی جنگوں نے اس تجارت کے دائرہ کار کی وسعت کو دور دور تک پھیلا دیا، قسطنطنیہ پر وینس والوں کا قبضہ، عیسائی زائرین اور جنگجوؤں کو فلسطین پہنچانا، مشرقی ممالک میں عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کو کمک فراہم کرنا، مشرق سے یورپ کو غلہ کی درآمد وغیرہ وہ اسباب ہیں جن سے تجارت اور بحری نقل وحرکت میں ایسی پھرتی آئی کہ جس کی نظیر رومی امپائر کی سربلندی کے بعد نہیں ملتی، یہ تجارت اپنے ساتھ یورپ کے لیے بڑی مقدار میں ریشمی کپڑے، شکر اور کالی مرچ، ادرک، لونگ، الائچی جیسے مصالحہ جات لے آئی، گیارہویں صدی کے یورپ میں یہ سب چیزیں نایاب اور آسائشی ساز وسامان تصور ہوتی تھیں، اس تجارت سے مشرق سے مغرب کو بڑی مقدار میں مختلف نباتات، جڑی بوٹیاں، اناج اور درخت منتقل ہوئے جن سے یورپ اس سے قبل اندلس کی اسلامی ریاست کے توسط سے متعارف ہوا تھا، ان نئی متعارف ہونے والی اشیا میں مکئی، چاول، تل، لیموں، خربوزہ، آڑو، شفتالو، کھجور، چھوٹی پیاز جو کہ شالوت اور عسقلانی کہلاتی تھی، عسقلان ثغر سے کشتیوں پر مشرق سے مغرب کو منتقل ہوتے تھے، شفتالو کو عرصہ تک برقوق دمشق کہا جاتا تھا، اس طرح اسلامی ملکوں سے سفید ریشمی کپڑا، دمقس، موسلین، ساٹین، مخمل، کشیدہ کاری کیے ہوئے دوسرے کپڑے، غالیچے، رنگ وروغن، آٹا، عطریات، زمین داروں اور متوسط طبقہ کے گھروں کو مزین کرنے اور ان کے مردوں اور عورتوں کو آراستہ کرنے کے لیے جواہرات پہنچتے تھے، برونز اور صیقل کی ہوئی دھاتوں سے بنے آئینوں کی جگہ کانچ سے بنے اور دھاتوں سے ڈھکے آئینوں

نے لے لی، یورپ نے مشرق سے شکر اور وینس کے آئینہ صاف کرنے کی صنعت سیکھی''۔(۵)

یورپ میں ہندوستانی مصالحہ جات کی اہمیت اتنی کیوں بڑھی اس سلسلے میں عبدالعزیز محمد الشناوی رقم طراز ہیں کہ:

''اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں جب کہ ریفریجیٹر اور چیزوں کو ٹھنڈا کر کے جما دینے والے بڑے آلات معروف نہیں ہوئے تھے، گوشت کو محفوظ رکھنے کے لیے ان مصالحہ جات کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی، اس زمانے کے یورپ کی آسائش زدہ اور خوش حال زندگی میں کھانا مشرقی مصالحہ جات کو ملائے بغیر نہیں کھایا جا سکتا تھا، اس پر مزید یہ کہ لونگ اور ادرک کا حکیمی نسخوں میں استعمال ہونے لگا تھا، یورپ کی عورتوں میں مشک و عنبر اور آب گلاب کی ضرورت بڑھ گئی تھی، یہ ضرورت اب کلیسا والوں کو بھی ہونے لگی تھی، انہیں بھی دھونی دینے کے لیے بخورات، عطریات، ہندوستانی جڑی بوٹیوں، افیم، کافور وغیرہ کی ضرورت پڑنے لگی تھی، جب کہ دوسری اشیا قہوہ، قیمتی پتھر، ہاتھی کے دانت، غالیچے، ریشمی کپڑے، یورپی معاشرے میں اظہار مفاخرت اور دولت کے اظہار کے ذریعے بن گئے تھے''۔(۶)

ان ہندوستانی مصنوعات کی تجارت سے تاجروں کو جو منافع حاصل ہوتا تھا، اس کی تفصیل شہر وینس کے مورخ چارل ڈیل نے یوں بیان کی ہے ''ایک کوئنٹل ادرک کی جو قیمت اسکندریہ میں گیارہ کروزاڈو (Crusados ستر برطانوی سنٹ کے برابر قدیم پرتگالی سونے کا سکہ) لگائی جاتی تھی، کالیکٹ میں اس کی قیمت چار کروزاڈو تھی، ایک کوئنٹل کالی مرچ کی جو قیمت ڈھائی تا تین وینسی سکہ تھی (ڈوکیٹ Ducat ۳،۴۹۴ گرام سونے کا وینس اور خلافت عثمانیہ میں رائج سکہ) یہ مرچ اسکندریہ میں (۸۰) سے کم پر ملنا مشکل تھی، باوجود اس کے تاجروں کے لیے یہ تجارت بہت منافع بخش تھی، ۱۵۰۳ء میں واسکوڈی گاما ہندوستان سے اپنے جہاز پر ساڑھے تین ہزار کوئنٹل کالی مرچ، دارچینی، ادرک اور جوز الطیب لاد کر لایا، جواہرات اور قیمتی پتھر ان کے علاوہ تھے، ان کی قیمت ایک ملین ڈوکیٹ لگائی گئی، جب کہ اس مہم کے اخراجات دو لاکھ ڈوکیٹ سے زیادہ نہ تھے، اس مہم میں مال لگانے والوں کو ملنے والا منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ تھا، لسبن کے دو ہزار ڈوکیٹ لگانے والے ایک گھر کو پانچ ہزار کا فائدہ ہوا۔(۷)

صلیبی جنگوں کے جگر سے اطالوی بحری جمہوریتوں خصوصاً جنوہ اور وینس کی بنیاد پڑی، جنھوں نے روایتی راستوں کے مطابق مشرق کی پیداوار کو شام کے راستے یورپ لانا شروع کیا اور وینس کے بحری بیڑوں نے مشرق کی محصولات کی یورپ درآمد شروع کی، دوسری جانب انہوں نے جنگجوؤں اور ان کے لیے راشن اور یورپین زائرین کو مملکت شام بھیجنا شروع کیا، جس کی وجہ سے تجارت اور جہاز رانی کو ایسا بڑھاوا ملا جس کی نظیر رومن امپائر کے بعد نہیں ملتی اور یورپ کے بازاروں کی دکانیں ریشمی کپڑوں، شکر، مصالحہ جات جیسے کالی مرچ، ادرک، لونگ اور الائچی وغیرہ کے ڈھیر سے بھر گئیں اور یہ اشیا گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ میں سامان تعیش شمار ہونے لگیں۔(۸)

لیکن مشہور واقعۂ حطین ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء اور بیت المقدس کا مسلمانوں کے ہاتھوں میں سقوط (اسی سال بحر اوسط کے مغرب میں مملکت پرتگال وجود میں آئی) اور پھر عکاظ ۱۲۹۰ء کا سقوط اور تدریجی طور پر ایوبیوں کے بعد آنے والے ممالیک (خاندان غلامان) کے دور میں دیار شام سے صلیبیوں کو نکال بھگانے کی وجہ سے اطالوی جمہوریتوں کے معاشی مقاصد کو سخت زک پہنچی اور یہاں کے بہت سے مشہور کاروباری خاندان افلاس اور قلاشی کا شکار ہوگئے۔(۹)

تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جنوہ والوں نے فارس (ایران) کے منگولوں کے ساتھ باہمی تعاون اور افہام و تفہیم سے ہندوستان کے بری راستے سے خلیج عرب (فارس) تک پھر یہاں سے بحر اوسط کی مشرقی بندرگاہوں تک مصالحہ جات کی درآمد کا خاکہ بنایا، گو یہ سوچ نافذ العمل نہ ہوسکی لیکن اس کے نتیجے میں مصالحہ جات کے علاقوں تک نئے راستے کی تلاش کی ان کی خواہش تیز تر ہوگئی، اس دوڑ کے نتیجے میں جنوہ اور وینس میں متعدد جنگیں چھڑ گئیں اور جنوہ کو بھاری تجارتی نقصان اٹھانا پڑا اور بحر اوسط کی کئی بندرگاہیں اس کی بالادستی سے نکل گئیں۔(۱۰)

لیکن وینس نے صلیبی جنگوں کے بعد شام میں ہونے والے نقصانات کی تلافی مشرق کے دوسرے تجارتی شہروں قاہرہ اور اسکندریہ کے ذریعہ مشرقی درآمدات سے کی، کیوں کہ یہ دونوں شہر ہندوستان، چین، ملقا اور انڈونیشی جزیروں سے یورپ کے لیے آنے والے سامان تجارت کے اہم ٹرانزٹ پورٹ بن گئے، ان کی اہمیت مصر میں سلطنت فاطمی کے دور ہی سے محسوس ہونے لگی تھی،

وینس نے اپنے تعلقات مصر و شام اور حجاز کے ممالیک سلاطین سے مضبوط کیے اور بحراحمر اور خلیج عرب (فارس) کے راستے آنے والے مشرقی سامان تجارت پر اپنی اجارہ داری مضبوط کی، اس غرض سے وینس نے اپنے چھ بحری بیڑے تیار کیے جن کی مدد سے پندرہویں صدی میں اس نے بے تحاشہ منافع کمایا جس سے ان جمہوریتوں کو بحر اوسط کے اطراف اپنی چودھراہٹ قائم کرنے میں مدد ملی۔ (۱۱)

لیکن وینس اور جنوہ کے تاجر قاہرہ اسکندریہ اور شام کے تاجروں کی دلالی میں دب سے گئے اور ان کی حیثیت ممالیک سلاطین کے ماتحت شام و مصر کی سرزمین سے گذرنے والے سامان تجارت پر ٹیکس دے کر مال چھڑانے والے تقسیم کنندگان کی سی ہوگئی۔ (۱۲)

یہ ٹیکس کبھی کبھار چیزوں کی اصل قیمت سے تین گنا زیادہ بڑھ جاتا تھا، لہذا پندرہویں صدی میں یورپ کا اصل ہدف عرب اور مسلمانوں کی سرزمین سے گزرے بغیر اور ان کی وساطت کے بغیر براہ راست مصالحہ جات کے اصل علاقوں تک رسائی ہو گیا تھا۔

یورپ کے جغرافیائی انکشافات کی تحریک کا آغاز اس سے ایک صدی پیشتر مارکو پولو جیسے سیاحوں کے انفرادی طور پر کیے گئے سفروں اور مہم جوئیوں سے ہو گیا تھا۔ (۱۳)

ایک دوسرا سفر یوگولینو دی فالڈو (Ugolono de Vivaldo) نے ۱۲۹۱ء میں ہندوستان پہنچنے کی غرض سے جنوہ سے جبل الطارق اور مشرقی ساحل افریقہ کا کیا تھا لیکن بعد میں اس کے نتائج معلوم نہ ہو سکے۔ (۱۴)

پھر حکومتوں کی جانب سے مصالحہ جات اور سونے کی سرزمینوں تک رسائی کے لیے کوششیں شروع ہوگئی، اس کے ساتھ ہی ۱۳۰۰ء - ۱۵۰۰ء کے دوران یورپ کی نشأۃ ثانیہ جسے اس وقت یورپ کی پیدائش نو کا نام دیا گیا تھا، ان انکشافات میں کمک کا اہم عامل ثابت ہوئی، خاص طور پر جب سے یورپ کے اہم شہروں میں سرمایہ دار طبقہ نے جنم لیا جس سے یورپ کی اقتصادیات کی ترقی میں مدد ملی، اس منفعت کے تبادلہ میں اس سرمایہ دار طبقہ نے جغرافیائی انکشافات کی مہموں کو اس نظریے سے دیکھا کہ جو چیز آنکھوں سے اوجھل ہو وہ اپنے ساتھ دولت لے آتی ہے، دور وسطیٰ میں یورپ کی نشأۃ ثانیہ میں اثر انداز ہونے والے ان تہذیبی مراکز سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے: جزیرہ نمائے ایبریا (اندلس)، جزیرہ سسلی اور جنوب اٹلی، دیار مشرق عربی (شام و مصر) صلیبی

جنگوں کے دوران ۔ (۱۵)

حالانکہ اٹلی کے سمندری شہروں جیسے وینس اور جنوہ نے مشرق سے تجارت اور یورپ میں اپنے تفوق کے طفیل اقتصادی خوش حالی کا مزہ اٹھایا تھا، لیکن یورپی نشاۃ ثانیہ کے نشانات اٹلی کے دوسرے شہروں فلورنس وغیرہ میں بھی نظر آنے لگے، ان شہروں نے مشرق کی عربی اسلامی تہذیب سے خوب خوشہ چینی کی جس سے یہاں علم و دانش کی تحریک پھلی پھولی، یورپ کے دوسرے شہروں پر بازی لے جانے میں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے۔

اٹلی کے ان شہروں خصوصاً جنوہ کے لوگوں نے چودھویں صدی میں اقتصادی حالات خراب ہونے پر یہاں سے اسپین اور پرتگال اور جزیرہ نمائے ایبریا کو ہجرت کی، اس وقت یہ مملکتیں اسپین سے مسلمانوں کے وجود کو نیست و نابود کرنے اور اسلام کے نام لیواؤں کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھیں اور اس غرض سے یہاں کی مسلم مملکتوں کے ساتھ ان کی جنگیں اپنے عروج پر تھیں نیز یہ مسلمانوں کی اقتصادی شریانوں کو شمال افریقہ اور مشرق عربی سے کاٹنے کے لیے کوشاں تھیں ۔ (۱۶)

چنانچہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے سرچشموں سے جغرافیائی اور فلکی معلومات حاصل کرنے والے سائنس دانوں کا ساتھ ملنے سے جغرافیائی انکشافات کی تحریک کو آگے بڑھانے میں زبردست مدد ملی، اس کے نتیجے میں بر و بحر اور کرہ ارض اور اس کے اطراف سفر و سیاحت کے بارے میں مفید افکار و خیالات اکٹھا ہونے لگے (یورپ میں جدید دور یورپ والوں کے نقطہ نظر سے ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء سے شروع ہوتا ہے جب قسطنطنیہ پر عثمانیوں کا قبضہ ہوا تھا اور مشرقی یورپ میں اسلامی عثمانیوں کی یلغار شروع ہوئی تھی) یہاں تک کہ نئے یورپ کے دور کے آغاز میں یہ بات عام ہوگئی کہ مشرقی ایشیا کا آخری سرا چین، جاپان اور مصالحہ جات کے جزیروں پر ختم ہوتا ہے ۔ (۱۷)

جس چیز نے عملی طور پر مصالحہ جات کے سرچشموں کی تلاش میں مہم جوئی اور جغرافیائی انکشافات کی تحریک کے آغاز کے بارے میں غور و فکر کرنے پر مجبور کیا وہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اہم تہذیبی پہلو اور علمی اداروں کا قیام (اکیڈمیاں، کتب خانے اور اسکول وغیرہ) تھے جو افریقی، یونانی، لاطینی تحقیقات کی سرپرستی کرتے اور علم آثار اور تاریخ کا اہتمام کرتے تھے اس کے علاوہ نئی ایجادات جیسے طباعت کے آلات اور بارود کی ایجاد جس نے طریقۂ جنگ میں زبردست

انقلاب برپا کیا اور متعدد فلکی آلات تک ان کی وغیرہ نے علم البحار اور سمندری معلومات میں بڑا کردار ادا کیا، اسطرلاب قطب نما، متحرک گیر وغیرہ نے جہاز رانی کے مفہوم کو وسعت دی اور قدیم بوسیدہ دیومالائی خرافاتی افکار و خیالات کو نکال باہر پھینکا، ایک نامعلوم کی تلاش میں یورپ کی جغرافیائی انکشافات کی تحریک نے راستے سے رکاوٹیں دور کیں اور مشرق کے پانیوں تک پرتگالیوں کو پہنچنے کی راہ ہموار کی۔ (۱۸) (باقی)

حوالہ جات

(۱) Panikkar, K.M. : Asia and Western Dominace (London 1959) p.2۔

(۲) محی الدین الالوائی: مجلۃ ثقافۃ الہند (۱۹۵۹) ۱- ۱۲،ص ۳۲۔

(۳) Boies, penrose, Travel and Discovery in Renaissance (1402-1692) U.K. 1960 p.2-۔

(۴) سونیا- ی- ھاو: فی طلب التوابل، ترجمہ محمد عزیز رفعت (القاہرہ، ۱۹۵۷) ص ۱۳ (۵) ول ڈیورنٹ، قصۃ الحضارۃ، عصر الایمان (بیروت ۱۹۸۸) ج ۴، باب ۳۳، Story of Civilisation۔ (۶) عبدالعزیز محمد الشناوی، اوربانی مطلع العصور الحدیثۃ (القاہرہ ۹۵۹)، ص ۲۰۱۔ (۷) البندقیہ: جمہوریۃ ارستقراطیہ، ص ۱۴۶۔ (۸) ول ڈیورنٹ، قصۃ الحضارۃ، عصر الایمان (بیروت ۱۹۸۸) ج ۴، باب ۶۸، Story of Civilisation۔ (۹) رینیہ کلوزییہ، تطور الفکر الجغرافی، ترجمۃ عبدالرحمان حمیدہ (دمشق ۱۹۸۲)، ص ۵۱۔

(۱۰) Panikkar, K.M. : Asia and Western Dominace (London 1959) p.20۔

(۱۱) اثر تحول التجارۃ العالمیۃ الی راس الرجاء الصالح علی مصر و عالم البحر المتوسط، ص ۲۷۔ (۱۲) رینیہ کلوزییہ، تطور الفکر الجغرافی، ترجمۃ عبدالرحمان حمیدہ (دمشق ۱۹۸۲)، ص ۵۱۔

(۱۳) Boies, penrose, Travel and Discovery in Renaissance (1402-1692) U.K. 1960 p.10,11۔

(۱۴) Boies, Panikkar, K.M. : Asia and Western Dominace (London 1959) p.32۔ penrose, Travel and Discovery in Renaissance (1402-1692) U.K. 1960 p.17.

(۱۵) عبدالعزیز محمد الشناوی، اوربانی مطلع العصور الحدیثۃ (القاہرہ ۹۵۹)، ص ۲۰۱۔ فاروق اباظہ، اثر تحول التجارۃ العالمیۃ الی راس الرجاء الصالح علی مصر و عالم البحر المتوسط اثناء القرن السادس عشر (القاہرہ ۱۹۸۶)۔

(۱۶) فیجی جی دی، تاریخ غرب افریقیا، ترجمہ و تعلیق السید یوسف نصر (القاہرہ ۱۹۸۲)، ص ۱۰۷۔ (۱۷) ھ-ا-ل- فیشر، تاریخ اوربا العصور الوسطی، ترجمہ مصطفیٰ زیادہ وآخرون (مصر ۱۹۵۷)، ص ۴۶۳۔ (۱۸) محمد حمید السلمان، الغزو البرتغالی للجنوب العربی والخلیج (ابوظبی ۲۰۰۴)، ص ۵- ۱۲۔

اسپین کے مسلمانوں پر عیسائی مظالم کی ایک جھلک

پروفیسر محمد حسان خان

اندلس اور متعلقات اندلس کا موضوع، راقم کے لیے ایک عرصے سے مطالعہ کا دل چسپ اور خاص مرکز ہے جس کی وجہ سے گذشتہ چند سالوں سے راقم نے اندلسیات کی طرف توجہ کی ہے، ''معارف'' میں اس سلسلہ کے دو مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں، ۲۰۰۶ء میں اسپین جانے کا موقع بھی ملا، گو قیام بڑا مختصر رہا اور ویزا کے مسائل کی وجہ سے دو دن ہی وہاں رہ سکا، تاہم قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع بہرحال ملا، عنقریب لمبی مدت کا سفر کرنا چاہتا ہوں تاکہ تفصیلی کام کا موقع ملے۔

اسلامی اندلس کی تاریخ گرچہ اب قصہ پارینہ ہے لیکن یہ قصہ اتنا دل کش، حیرت انگیز اور عبرت انگیز ہے کہ کسی نہ کسی پہلو سے یہ بار بار دہرایا جاتا ہے اور یہ کہنا قطعی مبالغہ نہیں کہ اندلس کے مسلمانوں کی شان دار حکومت اور آخر میں ان کی زبردست مظلومی نے اس موضوع کو سارے عالم میں عام کر دیا، اس وقت یورپ ولا یتہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکا میں اس ظلم و جبر کی تفصیلات پر بہت زیادہ کام ہو رہا ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے راز ہائے سربستہ بھی کھلتے جاتے ہیں، مثلاً یہی کہ کس طرح اسپین کے مسلمانوں نے صدیوں تک چھپ کر اپنے اسلام کی حفاظت کی، بظاہر وہ عیسائی بنا لیے گئے تھے لیکن وہ اندر سے پکے سچے مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہی ہے کہ ان لوگوں نے کتنی قربانیاں دی ہیں۔

عالم عرب و اسلام میں اس موضوع پر صرف فردوس اسلامی کے کھو جانے کے حوالے

تاج المساجد، بھوپال۔

سے باتیں کی جاتی ہیں لیکن اس موضوع پر کسی اہم علمی کام کی خبر نہیں تھی مگر اب معلوم ہوا کہ تونس کے پروفیسر عبدالجلیل شلبی یورپ اور امریکا میں انگریزی اور فرنچ میں شائع شدہ کاموں کا عربی ترجمہ کر کے عربوں کے لیے ریسرچ کا اہم میدان فراہم کر رہے ہیں۔

۲/جنوری ۱۴۹۲ء کو مسلمانوں کا اقتدار غرناطہ (اسپین) سے ختم ہوا اور الحمراء پر کارڈینل دبیدر کے ذریعہ صلیب نصب کرنے کے بعد عیسائی حکومت قائم ہوگئی، نئے حکم رانوں نے مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ تارتار کر دیا، اسلام کو اسپین میں ممنوع قرار دے دیا گیا، عربی زبان کا استعمال بھی یک لخت ختم کر دیا گیا، اسی طرح عربی نام رکھنا اور عربی لباس پہننا بھی جرم گردانا گیا، ان قوانین کو اس سختی سے نافذ کیا گیا کہ مخالفت کرنے پر سخت ایذائیں دی جاتیں حتی کہ زندہ جلا دیا جاتا۔

اس طرح اندلس کے لاکھوں مسلمان ہلاک ہو گئے یا ہجرت کر گئے یا بالجبر عیسائی بنا لیے گئے غرض ایک مسلمان بھی ایسا نہ بچا جو اپنے مسلمان ہونے کو ظاہر کر سکے۔

شدائد اور اذیتوں کی تفصیلات بھی پردہ خفا میں رکھی گئیں، تحقیق وتفتیش کے محکموں کے مظالم بھی اسپین کی عیسائی حکومت نے راز میں رکھے، کون سے حربے استعمال کیے جاتے رہے، ان کا علم بھی باہر والوں کو نہیں ہونے دیا گیا لیکن اسپین کے لہو کو کبھی نہ کبھی پکارنا ضرور تھا، چنانچہ ان تفصیلات کا علم موجودہ عہد میں بڑی تفصیل سے سامنے آنے لگا ہے۔

اس کی ایک مختصر روداد محمد الغزالی کی کتاب ''التعصب والتسامح'' کے صفحات پر بکھری ہوئی نظر آئی جس کو المسلم ویب سائٹ سے اخذ کر کے یہاں پیش کیا جاتا ہے:

سقوط اندلس کے ۳۲۶ سال بعد نپولین نے ۱۸۰۸ء میں اسپین پر حملہ کیا اور صدارتی فرمان جاری کر کے مملکت اسپین میں مسلمانوں کے متعلق تحقیق وتفتیش کی عدالت کو ختم کرنے کا اعلان کیا، فرانس کے ایک کمانڈر نے بتایا کہ انہوں نے ایک چرچ کی تلاشی لی جہاں تفتیشی محکمہ قائم تھا، اس کے تمام کمروں، ہالوں، گذرگاہوں اور گنبدوں کی تلاشی لی گئی، تحقیق کے دوران پادری حضرات جن کے سر جھکے ہوئے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے، وہ بڑی معصومیت سے قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ ہمارے چرچ پر تفتیش اور اس کے دوران مسلمانوں کی ایذاء رسانی

کا غلط الزام ہے، بظاہر ہم کو بھی وہاں ایسا کچھ نہ ملا جس سے ان پادریوں کے قول کو غلط ٹھہرایا جاسکتا، ہم وہاں سے نکلنے کا ارادہ کررہے تھے کہ لیفٹیننٹ دی لیل نے اپنے کرنل سے درخواست کی کہ مجھے اور تلاشی کا موقع دیں، مجھے شک ہے کہ عمارت کے نچلے حصے میں کچھ ہے جس کی تلاشی ہونا چاہیے۔

یہ سن کر پادریوں پر خوف کی ایک کیفیت طاری ہوئی، کمانڈر نے اجازت دے دی، زمین سے قالین اٹھائے گئے اور حکم دیا گیا کہ ہر کمرہ میں الگ الگ پانی بہایا جائے، ہم نے دیکھا کہ ایک کمرہ کے فرش پر یہ پانی کہیں جذب ہونے لگا، یہ دیکھ کر دی لیل خوش ہوگیا اور اس جگہ کو ادھیڑا جانے لگا تو وہاں ایک دروازہ نظر آیا، معلوم ہوا کہ آفس میں ایک میز کے پاس اس دروازے کے کھلنے کا بٹن تھا لیکن کوششوں کے باوجود اس بٹن سے دروازہ نہ کھلا تو فوجیوں نے بندوق کی بٹ مار کر دروازہ توڑ دیا، وہاں ایک زینہ نظر آیا جو نیچے کی تاریک گلیوں کی جانب اشارہ کررہا تھا، میں نے چرچ کی ایک میٹر لمبی شمع دان جو سامنے رکھی تھی اٹھائی اور نیچے جانے لگا، تب پادری نے بڑی نرمی سے کہا کہ بیٹے تم لوگ فوجی ہو، تم لوگوں کے ہاتھ خون خرابے میں ملوث ہوتے ہیں، اس لیے تم کو یہ مقدس شمع دان نہیں اٹھانا چاہیے، میں نے کہا کہ تمہاری یہ شمع دان شاید بے قصور لوگوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے، اس سے میرے ہی ہاتھ ناپاک ہوجائیں گے، یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہم میں سے کون قاتل اور ناپاک ہے۔

اس کے بعد میں اور میرے ساتھی فوجی نیچے پہنچ گئے، اندازہ ہوا کہ وہ کمرہ بہت پر ہیبت اور پراسرار ہے، پہلی نظر میں ظاہر تھا کہ بڑا کمرہ عدالت کا ہال تھا، اس کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا ایک ستون تھا، جس میں لوہے کا ایک بڑا اچھلا تھا، بڑی بڑی زنجیریں اس سے بندھی تھیں جن سے تفتیش کیے جانے والے افراد کو باندھا جاتا تھا۔

اس ستون کے سامنے ایک اسٹیج تھا جس پر تفتیشی عدالت کے افسران اور جج بے قصوروں کے خلاف فیصلہ دینے کے لیے بیٹھتے تھے، اس کے بعد ہمارے سامنے کمرے اور تعذیب خانے تھے، یہ کمرے بہت بڑے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے، معلوم ہوا کہ ان وسیع کمروں میں مسلمانوں کے جسموں کو چاک کیا جاتا تھا، صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کمروں یا جہنموں کو دیکھ کر ہمارے

رونگٹے کھڑے ہوگئے، کمانڈر کے الفاظ میں:

''میں نے وہاں وہ دیکھا جس کو بیان کرنے سے زبان قاصر ہے''، میں کانپ کانپ گیا اور جن منظروں کو آنکھوں نے دیکھا، زندگی بھر ان کی یاد سے بھی گھن آتی رہے گی، میں نے وہاں انسانی جسموں کے کچھ کھڑے اور کچھ آڑے ڈھانچے دیکھے، صاف ظاہر تھا کہ کچھ مسلمان کھڑے کھڑے موت سے دوچار ہوئے اور دوسرے موت کے حملوں سے زمیں بوس ہوگئے، بعد میں لاشیں سڑکر اور گل کر صرف ہڈیوں کے ڈھانچوں میں باقی رہیں، مرنے والوں کی بدبو خارج کرنے کے لیے چرچ کے اوپر کے حصے میں ایک چھوٹا سا سوراخ بنادیا گیا تھا۔

ہم نے وہاں ایسے انسانی ڈھانچے بھی دیکھے جو ابھی بھی مکمل ڈھانچے میں نہیں بدلے تھے یعنی یہ تعذیب کے سلسلے کو اب تک جاری رکھنے کی گواہی دے رہے تھے، ہمارے سامنے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، ۱۴ سال سے لے کر ۷۰ سال تک کی عمر کے مرد اور عورت قیدی تھے، بعض قیدی زندہ تھے جن کو ہم نے زنجیریں کاٹ کر زندہ بچایا، وہ زندگی کی آخری سانس لے رہے تھے، ان میں سے بعض ایذاؤں کی زیادتی سے ذہنی توازن کھو چکے تھے، یہ تمام قیدی مادرزاد برہنہ تھے، جن کو ہمارے فوجیوں نے اپنی چادروں سے ڈھانکا، یہ نظارہ عجیب تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ اسپین میں اسلام کے خاتمہ کے بعد بھی اس کے نام لیوا اب تک موجود تھے جن کو عیسائی ظالموں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ڈھونڈ نکالا تھا اور اس تعذیب خانے میں ڈھکیل دیا تھا، ہم ان بدقسمت قیدیوں کو آہستہ آہستہ روشنی میں لائے کہ وہ برسوں کے اندھیرے کے بعد اچانک روشنی کی وجہ سے اپنی بینائی نہ کھودیں، یہ قیدی خوشی سے رو رہے تھے اور فوجیوں کے ہاتھ پیر چوم رہے تھے کہ انہیں اس ہولناک عذاب سے نجات ملی اور گویا ان کو دوبارہ زندگی ملی، یہ ایسا منظر تھا کہ پتھر سے پتھر دل بھی رو دے۔

پھر ہم دوسرے کمروں کی طرف منتقل ہوئے، وہاں بھی ایسی چیزیں دیکھیں کہ بدن پر کپکپی طاری ہوگئی، وہاں ایذائیں دینے کے لیے بہت خطرناک آلات موجود تھے، ہڈی توڑنے اور جسم کا برادہ بنانے کی مشینیں وہاں نصب تھیں، پہلے پیر، پھر سینہ، سر اور ہاتھوں کی ہڈیاں باری باری توڑی جاتی تھیں، مشین کے دوسرے سرے سے ہڈیوں کا برادہ اور انسانی گوشت کا قیمہ

خون کے ساتھ نکلتا تھا۔

ایک چھوٹا پنجرہ نظر آیا جو انسان کے سر کے برابر تھا اس میں انسان کا سر داخل کر کے مقفل کر دیا جاتا، پھر ہاتھ پیر زنجیروں سے جکڑ دیئے جاتے تھے، اس کے بعد پنجرہ کے اوپر ایک سوراخ سے ٹھنڈے پانی کی ایک ایک بوند تسلسل کے ساتھ اس کے سر پر ڈالی جاتی تھی، قیدی کی موت تک یہ سلسلہ جاری رہتا، بہت سے لوگ اس ایذاء سے پاگل ہو جاتے۔

ایذاء اور تعذیب دینے کا ایک آلہ ایک تابوت نما صندوق کی شکل میں تھا جس میں نوکیلی چھریاں اور خنجر نصب تھے، اسی طرح اس صندوق کے ڈھکن میں بھی نوکیلے آلے موجود تھے، مظلوم قیدی کو اس میں لٹا کر ڈھکن کو بند کر دیا جاتا جس سے اس شخص کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔

وہاں ایک طرف ایسے ٹِک بھی دکھائی دیے جن کو قیدیوں کی زبان یا عورتوں کے پستانوں میں داخل کر کے کھینچا جاتا، جس سے ان اعضا کے ٹکڑے بکھر جاتے تھے، لوہے کے کوڑے بھی تھے جن سے مظلوموں کو برہنہ کر کے اتنا مارا جاتا تھا کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ جاتیں اور گوشت جسم سے الگ ہو جاتا، (۱) ہم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ''اس خوف ناک عذاب کا سلسلہ تین صدیوں تک کیسے جاری رہا''، چشم دید حالات کی یہ تفصیلات فرانسیسی کمانڈر کی زبانی ہیں لیکن المسلم ویب سائٹ پر ڈاکٹر سعید العتیبی کا ایک مضمون ۳۰/اگست ۲۰۰۸ء میں ظاہر ہوا جس سے معلوم ہوا کہ اسپین کی حکومت نے ان تمام آلات اور مشینوں کو ایک میوزیم میں محفوظ کر دیا ہے، عیسائی مذہب کے ماننے والوں کے ان آلات مظالم نے موجودہ حکومت کو شاید جفا سے توبہ کرنے یا توبہ ظاہر کرنے پر مجبور کیا کہ شاید لوگ اس سے عبرت حاصل کر کے اپنا متعصّبانہ رویہ تبدیل کریں، انہوں نے اپنے مقالہ میں اسی طرح کے ایک میوزیم کا تذکرہ کیا ہے جس میں یہ سب کچھ محفوظ ہے، اس کا خلاصہ بھی ہم یہاں پر درج کرتے ہیں:

''ہم لوگ ''مربلہ'' سے ''رُندة'' پہنچے اور ابوالبقاء میدان کے ایک سرے پر اپنی گاڑی کھڑی کی، مذکورہ ابوالبقاء ''رُندہ'' کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے سقوط اندلس کے المیہ کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا اور سقوط اندلس سے کچھ پہلے انہوں نے ایک نہایت غمگین مرثیہ لکھا تھا، اسپین کی حکومت نے اس میدان کا نام اسی شاعر کے نام پر ابوالبقاء اسکوائر رکھا ہے، رُندہ میں ہم نے وہ

بدترین میوزیم دیکھا جس میں ان اسپینی عیسائی ظالموں کی ظالمانہ تاریخ موجود ہے، ہم جب اندلس کے مسلمانوں پر اندوہناک مظالم کے بارے میں پڑھتے تھے تو مبالغہ محسوس ہوتا تھا لیکن اس میوزیم کے دیکھنے کے بعد ہم کو کوئی تردد نہیں رہا، بلکہ اگلوں نے جو تصویر کشی کی ہے وہ اب ہم کو کم نظر آنے لگی، ہم اس میوزیم میں بہت سی حقیقتوں سے واقف ہوئے، یہ ضرور ہے کہ وہاں انسانی ڈھانچے نہیں تھے لیکن ان کی جگہ اسپین کی حکومت نے موم اور دوسری دھاتوں کے انسانی ڈھانچے بنا کر تاریخ کی سچائیوں کو پیش کردیا ہے، ہماری نظریں تاریخ کے اس عدیم المثال انسانیت سوز مظاہر پر تھیں اور زبان پر ان وحشی شیطانوں کے لیے لعنت تھی جنہوں نے انسانی جسم میں رہ کر انسانیت کو شرمسار کیا تھا، میوزیم میں داخل ہوتے ہی وہی مناظر سامنے آئے جن کا مشاہدہ نپولین کی فوج نے کیا تھا، میوزیم میں ان مناظر کی پوری تصویر کشی کی گئی تھی، جہاں عدالت کا منظر تھا، ایک کرسی جس پر مسلمان قیدیوں سے اقبال جرم کرایا جاتا تھا لیکن بیٹھنے کی جگہ پر نہایت نوکیلی کیلیں تھیں جس پر بیٹھتے ہی انسان کی جان جسم سے نکلنے کے لیے بے تاب ہوجاتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے یہ کرسی اپنے بیٹھنے والے کے گوشت، لہو اور ہڈیوں کا رشتہ ختم کردیتی تھی، جسم پارہ پارہ ہوتا، مسلسل یہی عمل جاری رہتا جس کی نشان دہی اس کرسی پر لگے زنگ سے ہوتی ہے کہ مسلسل خون صاف کرنے کے لیے اس کرسی کو پانی سے دھلا جاتا، اسی کے اثر سے اس میں زنگ لگ گیا، ہمارے سامنے زنگ آلود کرسی اسی حقیقت کو بیان کررہی تھی۔

چشم تصور میں وہ مظلوم اور بے گناہ مسلمان جوان بچے، بوڑھے، مرد عورت سب تھے کہ یہ نوکیلی دھاتیں دھیرے دھیرے ان کے سینوں، رانوں، پنڈلیوں اور پیٹ میں داخل ہورہی تھیں اور اب ان کا کرب ہم محسوس کررہے تھے بلکہ ایک عجیب صدمے سے دوچار تھے، بے اختیار ان انسان نما وحشیوں پر زبانوں سے لعنتیں جاری ہوگئیں، یہ ان ظالم و جابر وحشی اسپینی حکمرانوں کا ایسا عار ہے جو کبھی دھل نہیں سکتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کام صرف ایذائیں دینے کی نئی نئی ترکیبیں نکالنا اور اس کی مشینیں اور آلات ایجاد کرنا تھا۔

ان مختلف آلات قتل میں ایک آلہ ایسا تھا جس سے آدمی دھیرے دھیرے مرتا ہے، دوسرا آلہ وہ تھا جس سے تکلیف کے ساتھ گلا دبایا جاتا تھا، بہت خطرناک قسم کے ہک جن سے جسم کے

اعضا کے پرخچے اڑائے جاتے تھے، وہاں ایسے آلے نمونہ کے طور پر موجود تھے جن سے جسم کے دو حصے کر دیے جاتے تھے، ایسے پنجرے جس میں قیدی موت تک کھڑا رہے، آڑے پنجرے جس میں انسان مرنے تک لیٹا رہے، خطرناک رسیاں جو جسم کے حصوں کو باندھ کر مختلف سمتوں میں کھینچتی تھیں۔

ایک آلۂ قتل ایسا بھی تھا جس سے آہستہ آہستہ پیچھے سے گردن کو دبایا جاتا تھا، جس میں کیلیں بھی پیوست تھیں۔

ایک آلۂ قتل ایسا تھا جس سے پیٹھ اور ریڑھ کی ہڈی توڑی جاتی تھی۔

ان ظالمانہ آلات اور ان کے ذریعہ سزاؤں کی سچی تعبیر موم کے پتلوں کے ذریعہ اتنی مہارت سے پیش کی گئی ہے کہ ان کو دیکھ کر میں لرز اٹھا اور اچانک بے ارادہ میں چیخنے لگا، دوستوں اور دوسرے سیاحوں کی مدد سے میرے ہوش واپس آئے، سچائی یہی ہے کہ یہ ایسے مناظر تھے جو شاید کسی بھی دیکھنے والے کو بے ہوش کر دینے کے لیے کافی تھے۔(۲)

اسپین کے متعصب بادشاہ اور ظالم پادریوں نے یہ حشر ان مسلمانوں کا کیا جو ان کے سب سے بڑے محسن تھے، جنہوں نے اپنے آٹھ سو سالہ دور حکومت میں اس خطہ کو علم و دانش اور تہذیب و تمدن کی جنت اور دنیا کی سب سے ترقی یافتہ مملکت بنا دیا تھا اور پھر یہی تہذیب و ترقی شمالی یورپ کی طرف منتقل ہو کر یورپ کی نشأۃ ثانیہ کا ذریعہ بنی تھی لیکن مسیحی دنیا کی یہ بے غیرتی بھی کم تکلیف دہ نہیں کہ ان کی زبانیں اب بھی یہی کہتی ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا، ان کے حقد و حسد اور دلوں کی سختی اور ان کے مزاجوں کی درندگی اس وقت بھی تھی، آج بھی ہے۔

حوالے

(۱) المسلم ویب سائٹ، ص ۲۔

(۲) المسلم ویب سائٹ، ص ۱۔

اخبار علمیہ

شاہ فہد نے ۱۴۰۵ھ میں قرآن مجید اور اس کی تعلیمات کو ساری دنیا کی معروف زبانوں میں شائع کرنے کی غرض سے مرکز برائے طباعت قرآن مجید قائم کیا تھا، اب تک اس مرکز نے قرآن مجید کے ۲ کروڑ ۱۳لاکھ ۶ ہزار ۲۹۳ نسخے شائع اور پوری دنیا میں مفت تقسیم کیے ہیں، دنیا کی ۵۰ مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کا کام مکمل ہو چکا ہے، ترجمہ کے لیے باقاعدہ متعلقہ زبان کے ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کی جاتی ہے، تین حصوں میں منقسم اس کمیٹی کا پہلا گروپ ترجمہ کرتا دوسرا اس کی نوک پلک درست کرتا اور تیسرا اس پر نظر ثانی کرتا ہے، ادارہ ان کی خدمات کے لیے اعلیٰ تنخواہیں مقرر کرتا ہے، تراجم کے علاوہ اس مرکز نے قرآن مجید کی تلاوت پر مشتمل کئی ملین کیسٹ اور سی ڈیز کو بھی تیار کیا ہے، مزید یہ کہ مختلف زبانوں میں قرآن مجید کی تفسیروں کی طباعت و تقسیم اور قرآنی علوم و معارف پر مشتمل اعلی پایہ کے مقالات کی اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔

---

۵۴ ہزار امریکی مرد و خواتین سے مذہبی اعتقادات سے وابستگی کے بارے میں سوالات کیے گئے تو معلوم ہوا کہ ۱۵% تعداد یا تو اپنے دین سے ناواقف ہے یا منکر دین ہے، اسی قسم کا ایک جائزہ ۱۹۹۰ء میں کرایا گیا تھا تو مذہب سے بے خبروں کی تعداد ۸% تھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو عیسائیت سے منسوب کرنے والے افراد میں ۱۰ فیصد کمی آئی ہے، اس کے برعکس امریکی مسلمانوں میں واضح اضافہ دیکھا گیا جو امریکہ کی موجودہ تین سو ملین آبادی کا ۲ سے تین فیصد حصہ ہیں، مجموعی طور پر امریکہ میں مذہب سے بے خبری بلکہ بے اعتنائی میں یہ اضافہ خوش آئند نہیں ہے۔

انجیل کا سولہ سو سالہ قدیم اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل نسخہ انٹرنیٹ پر مہیا کرایا جا چکا ہے، یونانی زبان کے اس نسخے پر برطانیہ، جرمنی، مصر اور روس میں تحقیقی عمل جاری ہے، ماہرین کا خیال ہے کہ اس کے دستیاب ہونے سے ابتدائی دور میں عیسائیت کی ترقی کے راز سے تو پردہ اٹھے گا ہی

ساتھ ہی معلومات کی اور راہیں بھی کھلیں گی کہ کس طرح انجیل نسل درنسل منتقل ہوتی رہی، برٹش لائبریری نے بھی اس کی نمائش کا اہتمام کیا ہے جس میں اس نسخے سے متعلق کئی نادر تاریخی حوالے پیش کیے جائیں گے، یہ نسخہ ۱۸۴۴ء میں مصر کی ایک خانقاہ سے ملا تھا۔

جدید انسانی طرز معاشرت کی وجہ سے پیدا ہونے والا دھواں زمین کے گرد کاربن ڈائی آکسائیڈ کی چادر کو دبیز تر کرتا جارہا ہے جس کی وجہ سے سورج کی تمازت فضا میں سرایت تو کرتی ہے لیکن خلا میں واپس نہیں جا پاتی، زمین کی درجۂ حرارت میں تدریجی اضافہ کی وجہ یہی ہے اور اسی سے کرہ ارض کی آب و ہوا کا توازن بگڑ رہا ہے، سائنس دانوں کے مطابق اگر درجۂ حرارت پر قابو نہ پایا گیا تو زمین پر تباہ کن موسمی تغیرات جیسے سیلاب، سمندری طوفان اور خشک سالی میں اضافہ ہوگا اور انجام کار جو تباہی، قحط سالی بپا ہوگی وہ ادارہ آکسیفم کے بقول اس دور کا سب سے بڑا انسانی المیہ ہوگی، ادارہ نے ترقی یافتہ ملکوں سے درخواست کی ہے کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج کو ۲۰۲۰ء تک ۱۹۹۰ء کی سطح سے کم سے کم چالیس فیصد کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

مرمرا یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ایک سمپوزیم ''اسلامی تہذیب اور بغداد'' کے عنوان کے تحت استنبول میں منعقد کیا گیا، جس میں آغاز سے منگول تک اور عثمانی دور سے موجودہ عہد تک کے بغداد کی سیاسی، اقتصادی، سائنسی، تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، تاریخ اور غیر مسلموں سے تعلقات، طرز تعمیر اور فن و ادب کے مختلف گوشوں پر تیرہ ملکوں کے ۱۸۲ اسکالر نے مقالات پیش کیے، اس یادگار موقع پر تاریخی نوادر کی ایک نمائش اور ارسیکا کی ایک کتاب کا اجرا بھی ہوا جس میں اہم دستاویزات کے عکس، عربی ترجمہ اور قیمتی تاریخی تصویریں شامل ہیں۔

ترکی کا مشہور علمی و ثقافتی ادارہ ارسیکا ۱۹۹۰ء سے تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو اعزازات سے نوازتا ہے، تازہ اعزاز پانے والوں میں مصری ماہر تعمیرات عبدالتواب اسلامی فن تعمیر اور آثار قدیمہ میں نمایاں مقام کے حامل ہیں، ان کو مسجد شاہزاد مثقال کے لیے، ترکی کے پروفیسر خلیل ساحل اوغلو کو مسلم دنیا کے اقتصادی نظام کی تاریخ کے مطالعے اور

اس سے متعلق دستاویزات تک محققین کی رسائی کو آسان بنانے کے لیے، پروفیسر میر قاسم عبدالاحد عثمان تاتارستان کے ممتاز تاریخ داں کو آلتائی زبانوں اور ثقافتوں کے مطالعے اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے تحریری ورثہ کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے لیے اور عہد مملوک اور تاریخ دولت عثمانیہ میں اختصاص رکھنے والے پروفیسر عدنان البا خط کو بلاد شام کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے اور بلقان میں عہد عثمانیہ کے طرز تعمیر کے ماہر، ہائی لینڈ کے پروفیسر مائیکل کیل کو بلقان اور جنوبی مشرقی یورپ میں اسلامی طرز تعمیر کے نمونوں سے متعلق مواد کی جمع و ترتیب اور ان علاقوں میں اسلامی طرز تعمیر کی نمائندہ عمارتوں کی بحالی اور حفاظت کے لیے اور ڈاکٹر علی حداد عاد کو اسلامی تہذیب کے مطالعہ و فروغ دینے کے لیے ارسیکا انعامات سے سرفراز کیا گیا ہے۔

مصر کی شیر بنی نامی خاتون کو جرمنی کی عدالت میں ایکسل نامی ایک جرمن شخص نے چاقو مار کر قتل کر دیا، شیر بنی حجاب کی قائل و راس پر عامل تھیں، اس لیے قاتل نے پہلے تو ان کو ''دہشت گرد'' کہا اور جب خاتون نے مذہبی شناخت کی توہین کرنے کے لیے عدالت میں فریاد کی تو عدالت نے ایکسل کو قصوروار قرار دے کر ۵۰ ہزار روپے کا جرمانہ عاید کر دیا، اس فیصلہ کے خلاف ایکسل نے بھری عدالت میں خاتون کا خون کر دیا، مصر کے اخبارات نے اس واقعہ پر سخت ناراضگی ظاہر کی ہے اور خاتون کو ''شہیدۃ الحجاب'' کا خطاب دیا ہے۔

کراچی الکٹرک سپلائی کارپوریشن پاکستان کے استفتا پر متعدد مفتیوں نے فتوی دیا ہے کہ بجلی کی چوری حرام ہے، فتوی میں کہا گیا ہے کہ اپنے ذاتی کاموں یا دینی مجلسوں کے لیے جو مسلمان بجلی چوری کے مرتکب ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اس گناہِ عظیم سے توبہ کرتے ہوئے اب تک کی چوری کی گئی بجلی کی ادائیگی کریں، رپورٹ کے مطابق گذشتہ برس اس چوری کے سبب ۱۶/ارب روپے کا نقصان ہوا اور اس سال ہر ماہ ڈیڑھ ارب کا خسارہ ہو رہا ہے، اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو ملکی اور سرکاری معیشت کی بتی اپنوں ہی کے ہاتھوں گل ہو سکتی ہے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مکتوب ممبئی

فلیٹ -۲۰، چوتھا منزلہ،
نزد جامع مسجد نو پاڑہ،
باندرہ (ویسٹ) ممبئی ۵۰۔

مدیر مکرم ''ماہنامہ معارف''اعظم گڈھ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جون کے شمارہ میں جناب محمد عبدالرحیم قریشی صاحب کا معلوماتی مراسلہ دیکھا لیکن اس میں بعض باتیں وضاحت طلب ہیں، مثلاً غزل کے کسی شعر میں اگر نام لیے بغیر نبی رحمتؐ کی تعریف کی گئی ہو تو اس کو شاعر کی نشان دہی کے بغیر کیسے نعت کا شعر کہا جائے گا ؟ فیض کا اپنے بعض شعروں کو نعت کا شعر کہنا سر آنکھوں پر، مگر جو شاعر اپنے شعروں کا مطلب واضح کرنے کے لیے زندہ نہیں ہیں استعارہ آمیز زبان میں کہے گئے ان کے شعروں کا کیا مطلب نکالا جائے گا ؟ کسی کا غالباً جلیل مانک پوری کا مشہور شعر ہے ۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

غزل کے اس شعر کو نعت کا شعر کہا جا سکتا ہے مگر جب خود شاعر کو اس پر اصرار نہیں تو ہم کو بھی نعت کے شعر کے اقرار کی ضرورت نہیں؟ جناب شمیم طارق نے فیض کے کلام سے وہ مثالیں پیش کی ہیں جن میں براہ راست قرآن حکیم کا حوالہ ہے، کوئی ابہام نہیں ہے اور شاید اس انداز سے فیض کے شعروں کا مطالعہ پہلی مرتبہ کیا گیا ہے جو جناب شمیم طارق کا کارنامہ ہے، جناب عبدالرحیم قریشی صاحب نے اپنے مراسلے میں مضمون نگار کا نام تک نہیں لکھا ہے، اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

تمام تر حسن ظن کے باوجود فیض کے غزل کے شعروں کے حوالے سے ان کو نعت گو شاعر ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ (مولانا) محمد شعیب کوٹی

مکتوب علی گڑھ

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ

برادرم عمیر الصدیق زید فضلکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جون کے معارف صفحہ ۴۷۲ پر فیض کو نعت گو ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہے، ہزاروں اشعار کے رنگ برنگے مجموعۂ کلام میں اگر کسی شاعر کے ہاں دو تین نعت کے شعر نکل آئیں تو وہ نعت گو کیسے کہلائے گا ؟ قدیم اردو شاعروں میں غیر مسلموں نے بھی چند شعر نعت کے کہے ہیں تو کیا وہ سب نعت گو ہو گئے ۔

جویائے خیر
رئیس احمد نعمانی

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی (حصہ ہفتم): از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ،متوسط تقطیع ،عمدہ کاغذ و طباعت ،مجلد ،صفحات ۴۲۲ ، قیمت ۱۲۰ روپے ، پتہ : مکتبہ اسلام ، روَف مارکیٹ، ۴۱ گوئن روڈ ،لکھنو ۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۹۹ء تک کا عرصہ گویا ایک صدی پر محیط ہے اور یہ زمانہ ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام کے لیے کہنا چاہیے کہ انقلابات وتغیرات ،مسائل ومصائب اور فتن وحوادث کا ایسا زمانہ ہے جس کی مثال تاریخ میں غالباً کم ملتی ہے ،مولانا علی میاں ندویؒ کی زندگی اسی عرصے کی داستان ہے جس کو انہوں نے ''کاروانِ زندگی'' کی شکل میں اس طرح سنایا کہ یہ آپ بیتی اور جگ بیتی اس پورے عہد کی تعلیمی ، سیاسی ، معاشرتی اور مذہبی تاریخ کا مستند اور معتبر حوالہ بن گئی ، کاروانِ زندگی کا یہ سلسلہ سات مراحل سے گزرا ، مصنف جلیل نے اس سلسلہ کو خود سبع سیارہ سے تعبیر کیا تھا ،سفر ، دورے ، اجتماعات ، ملاقاتیں ، احباب و معاصرین کے مرثیے اور ہر لحہ تغیر پذیر دنیا کی تصویر کشی ،مصور کے موئے قلم نے اس سچائی اور مہارت سے کی کہ خود مصور کو یقین تھا کہ اس مرقع آرائی سے زمانے کی نبض پہچاننے میں وہ مدد مل سکتی ہے جو تاریخ اور آپ بیتیوں سے کم ہی حاصل ہو پاتی ہے ، زیر نظر حصہ کاروانِ زندگی کے آخری مرحلہ کی داستان اور اس سے زیادہ دستاویز ہے جس میں جنوری ۱۹۹۷ء سے جولائی ۱۹۹۹ء تک حضرت مولانا ندویؒ کی شام زندگی کے پس منظر میں اصلاحی و دینی تحریکوں ، ادب اسلامی ، قادیانیت ، دینی تعلیمی کونسل ، پیام انسانیت ، مسلم پرسنل لا بورڈ ، تحفظ ختم نبوت ، الکشن ، سیاست ،صحافت کے تمام رنگ جھلملاتے نظر آتے ہیں ، احباب و معاصرین جیسے شیخ ابوغدہ ،مولانا منظور نعمانی ، قاری سید صدیق احمد ،مولانا محمد عمر پالن پوری ، پروفیسر خلیق احمد نظامی ،سید حبیب الحق ندوی ،شہاب الدین دسنوی ،شیخ بن باز علی طنطاوی ، محمد المجذ وب اور حکیم عبدالحمید جیسے ہم نفسوں کے فراق کا ذکر ہے تو ہندوستان اور بیرون ہند کے بعض اہم اسفار کی روداد بھی ہے ، اس کاروانِ سفر کی ہر منزل گرچہ جدا جدا ہے لیکن کارواں کی سمت متعین ہے اور حدی خوانی کی لے بھی ایک ہے ، میر کارواں کا رخت سفر یقین ،عمل اور محبت پر مشتمل ہے ، اس لیے اس کارواں میں شامل ہر قاری کو بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ منزل ما دور نیست ، میر کارواں کے آخری پانچ مہینوں میں یہ کارواں کن مقامات سے گزرا ، اس کی حکایت شاید ابھی مرتب بھی نہیں ہوئی تھی کہ صاحب کارواں کو اپنی منزل مقصود مل گئی ، زندگی

کی شام ڈھلی تو آفتاب کسی اور برج کا ہوگیا، ان آخری دنوں کے نقوش کو مولانا سید محمد رابع ندوی نے تلاش کر کے اس طرح پیش کر دیا کہ حدی خوانی کی لے میں ذرا فرق نہیں، حضرت مولاناؒ کی آخری ساعتوں کا ذکر نہایت موثر ہے اور حقیقتاً ایک مثالی اور لائق تقلید زندگی کے حسن انجام کا بہترین پیغام بھی ہے۔

قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو تراجم کا تقابلی جائزہ: از ڈاکٹر محمد شکیل اوج، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۶۴، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: دار التذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

اردو زبان کے امتیازات میں شاید یہ بھی شمار کیا جائے کہ اس میں قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر کی کاوشیں سینکڑوں میں ہیں، پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے یہ موضوع واقعی بہت مناسب ہے کہ ان تمام ترجموں اور تفسیروں کا تعارف کرایا جائے اور ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے، زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک مبارک کوشش ہے جس میں مرکزی موضوع آٹھ معروف و متداول ترجموں کا تقابلی جائزہ ہے، یعنی مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا دریابادی، مولانا مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، پیر محمد کرم شاہ ازہری اور مولانا ابومنصور کے ترجموں اور تفسیروں کا انتخاب کیا گیا ہے، مختلف مکاتب فکر کی نمائندگی سے یہ انتخاب بامعنی ہے، اس کے علاوہ اس میں زمانے کی رعایت بھی کی گئی یعنی مولانا محمود حسن دیوبندی متوفی ۱۹۲۰ سے مولانا ابومنصور متوفی ۱۹۹۹ء تک ترجموں اور تفسیروں کے اسلوب اور زبان میں زمانے کے تغیرات بھی شاید لائق مصنف کے پیش نظر ہیں، اصل مقالہ تین فصلوں اور چھ ابواب میں منقسم ہے، پہلے، موضوع کا تعارف، دائرہ بحث اور ضروری مصادر پر گفتگو پھر ابواب میں ترجموں کی ضرورت، ابتدا، ارتقا، ترجمہ نگاروں کا تعارف اور پھر زبان و معانی اور ادب کے تعلق سے ان ترجموں کا تقابلی تجزیہ کیا گیا ہے، کتاب کی افادیت اس کے عنوان سے ظاہر ہے، مقالہ نگار نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کرنے کی سعی کی ہے، تقابلی جائزے میں خود ان کا محاکمہ بھی ہے اور یہ ان کے اعتماد سے زیادہ ان کے ذوق کا مظہر ہے، عبارت بھی صاف ہے مگر بعض جملوں میں تعبیر میں غرابت ہے، مثلاً یہی کہ ''تحقیق وتخلیق کے حسین امتزاج سے مخروج ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے''، ایک سرخی یہ ہے کہ ''منتخب اردو تراجم کا تقابل بلحاظ لغویت''، یہاں لغت کا لفظ کافی تھا، مولانا دریابادی کی ایک صاحب زادی کا نام بھی غلط لکھ دیا گیا ہے، صحیح زہیرہ ہے زبیرہ نہیں، یہ جذبہ لائق تحسین ہے کہ مسلمان کسی مکتب و مسلک کے ہوں اور کسی بھی مترجم یا مفسر کے عقیدت مند ہوں، مقصود، فہم قرآن ہو اور ان ترجموں کو وہ محض ایک

ذریعہ تفہیم سمجھیں، حرف آخر نہ سمجھیں۔

خزینۂ واصف (حصہ دوم): از حکیم محمد مرزا واصف ردولوی مرحوم، مرتبہ ڈاکٹر انور حسین خاں، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر نہال رضا عسکری کلینک ردولی، ضلع بارہ بنکی، دانش محل امین آباد، لکھنؤ۔

اودھ کے مردم خیز قصبات کے ذکر میں ردولی کا نام بے ساختہ زبان پر آتا ہے، اس کی سرزمین علم و ادب و شعر کے لیے ہمیشہ سازگار رہی، چودھری محمد علی، مجاز، شارب اور پروانہ کو شہرت کی دولت ملی لیکن ایسے باکمال بھی وہاں ہمیشہ رہے جو شہرت سے بے نیاز رہے، ایسوں میں واصف صاحب بھی ہیں جو تخلص سے کم اور حکیم ممدو کی عرفیت سے زیادہ پہچانے گئے، اس کتاب کے لائق مرتب نے کئی برس پہلے اسلاف کی مرتبہ شناسی کے جذبے سے حکیم محمد مرزا واصف کے کلام کو جمع کر کے شائع کیا تو اہل نظر سے اس کی داد ملی، ''معارف'' نے اس وقت لکھا تھا کہ ''بلند و پاکیزہ خیالات اور نہایت شائستہ و شستہ اور بامحاورہ زبان نے غزلوں کو کیف و سرور عطا کر دیا ہے''، زیر نظر مجموعہ میں واصف صاحب کا بقیہ کلام آ گیا ہے، غزلوں کے ساتھ کچھ نعتیہ کلام اور رباعیات و قطعات نے اس خزینہ کو اور زینت بخشی ہے، غزلوں کا حسن انتخاب قابل داد ہے، کیسے کیسے شعر آ گئے ہیں:

محشر میں زخم دل بھی مرا ہم زباں نہیں ۔۔۔ اپنے بھی غیر ہو گئے قاتل کے رعب سے
کثرت ہے پھر بھی پلّۂ عصیاں گراں نہیں ۔۔۔ اللہ رے عقیدہ لا تقنطوا کا وزن
بہت پچھتائے وہ سن کر ہماری داستاں ہم سے ۔۔۔ انہیں کیا علم تھا افسانۂ درد و الم ہوگا

لائق مرتب کے قلم سے خوب صورت تمہید اور عصمت ملیح آبادی و حنیف نجمی کی تحریر سے واصف مرحوم کی شخصیت اور فن کی قدر اور بڑھ جاتی ہے، آخر میں خزنیہ واصف حصہ اول کے متعلق اہل علم و قلم کی رائیں بھی کتاب کی افادیت میں اضافہ کرتی ہیں، لائق مرتب اس خزینے کی دریافت اور سلیقے سے پیش کرنے کے لیے مبارکباد کے لائق ہیں۔

اصلاح معاشرہ اور اسلام: از مولانا محمد شمشاد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۸، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: جامعۃ الہدایہ، رام گڑھ روڈ، جے پور اور دہلی و لکھنؤ کے مشہور مکتبے۔

معاشرے کی اصلاح کے متعلق دردمند اور فکر مند دل و دماغ مسلسل کوشاں ہیں، موجودہ زمانے

میں حالات کو دیکھتے ہوئے یہ فکرمندی اب تشویش میں بدل گئی ہے، اسلام کو مکمل دین اور مستقل تہذیب اور انسانیت کے لیے سب سے معقول ومتوازن مذہب ماننے والے جب اپنے ہی دین کی بنیادی تعلیمات سے غفلت اور بے توجہی، بدعملی اور انکار کے شکار ہوں تو واقعی یہ حساس دلوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے، یہ کتاب بھی ایسے ہی ایک فکرمند دل کے جذبات کا اظہار ہے جس میں شادی بیاہ اور رسم ورواج کی تقریبات میں فضول خرچی کے علاوہ تاخیر سے شادی اور بیوی کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت اور حسد، تکبر، ظلم، شراب، جوا اور رشوت جیسی برائیوں کے بیان کے ساتھ نکاح اور ولیمہ کی سادگی، جہیز کی شرعی حیثیت، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری، وراثت میں عورتوں کے حصے اور مسلمان کی جان مال آبرو کی عزت کا اسلامی سبق پھر دہرایا گیا ہے کہ امت مسلمہ جن مصائب میں مبتلا ہے ان میں اکثر خود اس کی غفلت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہیں، لائق مرتب نے بڑے سلیقے سے ان کام کی باتوں کو سادہ اور پراثر انداز میں بیان کردیا ہے، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا سید نظام الدین اور مولانا ضیاء الرحیم مجددی کی تحریروں نے اس کتاب کو اور مضمون کی اہمیت کو اور وقیع بنادیا ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر گھر میں اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے مضامین کی تلقین کی جائے۔

مشرقی کتب خانے: از مولانا عبدالسلام ندویؒ، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۸۷، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: ۸- پہلا منزلہ، ہندوستان بلڈنگ ۲/۱۰- ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی- ۴۔

مولانا عبدالسلام ندوی کا قلم اپنے استاذ ومربی علامہ شبلی کی طرح علم کے ہر میدان کا فاتح تھا، کتب خانوں کی تاریخ سے علامہ شبلی کو خاص دلچسپی تھی، ان کو ایسے تاریخ دانوں سے شکایت تھی جو عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن کتب خانوں کا نام تک نہیں لیتے، کتب خانہ اسکندریہ اور اسلامی کتب خانے کے عنوان سے اور اپنی دوسری کتابوں میں کتب خانوں کے ذکر سے وہ کبھی غافل نہیں رہے، علامہ شبلی کا اثر تھا کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس موضوع پر کئی اہم تحریریں ''الندوہ'' اور ''معارف'' میں سپرد قلم کیں، معلومات کا یہ خزینہ ان رسائل کی فائلوں میں محفوظ تو رہا لیکن اب ان سے استفادے کی راہ، نئی نسل کے لیے آسان نہیں، اس ضرورت کو محسوس کرکے مولانائے مرحوم کی ایک سو پچیسویں برسی کے موقع پر ان مضامین کا یہ انتخاب گویا بہترین خراج عقیدت ہے، جناب شمیم طارق کے مفصل مقدمے نے اس مجموعہ کو مفید تر بنادیا ہے۔

ع-ص